

مقدمہ ریاض القرآن

أُصُولُ الْقُرْآنِ

ہم نے قرآن کی تفہیم کے لئے ائمہ محققین کے جمع کردہ چند اصول و قواعد جمع کر دیئے ہیں جب تک کوئی عالم ان پر عبور نہ رکھتا ہو لازماً وہ ہدایت کی بجائے کسی عظیم فتنے میں مبتلا ہو جائے گا۔

علامہ ابوالخیر اسدی

مجلس نشر السنۃ
مخدوم ارشید
(ملتان)

مقدمۃ القرآن

اللہ تعالیٰ نے قرآن اُنار کرنی نوع انسان پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اپنے اس دین کو جس کو انسانوں کی آغاز آفرینش سے ان کی ہدایت کے لئے بنایا تھا اس کتاب کریم میں مکمل کر دیا اور اعلان کر دیا کہ: —

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (۵)
 آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمہارے اوپر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا —
 قرآن کریم ایسی صاف عربی زبان میں نازل ہوا جس کو عام طور پر اہل عرب سمجھتے تھے، خود قرآنی آیات میں اس کی زبان "عربی میں" بھی گئی ہے
 یعنی کھلی ہوئی اور واضح۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے اپنے کو "نور میں" کہا ہے۔ نیز قرآنی آیات کو بھی "آیاتِ بینات" کے نام سے موسوم کیا ہے۔
 بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي ضُدُورٍ الَّذِينَ أَوْ تَوَالِحُوا — (۲۹)
 بلکہ وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے —

الغرض — قرآن کی زبان، قرآن کی تعلیم اور قرآنی آیات کا مفہوم سب خود قرآن کے بیان کے مطابق واضح، کھلا ہوا اور علم کا ہوا
 نور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بار بار تصریح کی ہے کہ: —
 وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (۵۳)
 ہم نے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان بنا دیا ہے۔ کوئی ہے جو نصیحت کی
 نصیحت لینے کی آسانی کو دیکھنے کے لئے خود اہل عرب پر نظر ڈالنا کافی ہے جو قرآن کے اولین مخاطب اور بالعموم بدوی اور ناخواند تھے
 جس کی وجہ سے قرآن نے اُن کو "امیتین" کا لقب دیا اور فرمایا: —

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَهُوَ الَّذِي يُضَرِّفُ لَكَ الْعَزَّاقِ وَقَدْ نَبِّئَكَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغُلَامَ فِي السَّحَابِ لِلَّذِينَ يُسَلِّطُونَ عَلَيْهِمُ الْغُلَامَ أَنْ يَكُونُوا رِجَالًا عَالِفِينَ (۱۰۴)
 وہی ہے جس نے اُٹھایا اُن پڑھوں میں انہیں میں سے ایک رسول۔
 ان امیتوں نے بے تکلف قرآن کو سمجھا اور اس کے اوپر عمل کیا اور کامیاب ہوئے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں: —
 ان القرآن نزل بلغته العرب على اساليب بلاغتهم وكانوا كلهم يعرفهم من ذلك ويعلمون معانيه
 فی معزذاته وتراكيبه ۱۵ —

قرآن عرب کی زبان میں ان کے اندازِ بلاغت کے مطابق نازل ہوا۔ ہر ایک اس کو سمجھتا تھا اور اس کے مفردات و مرکبات کے معانی
 کا علم رکھتا تھا۔ — علامہ موصوف کا مقصد غالباً یہ ہے کہ اہل عرب بالعموم قرآن سے اس کی تعلیمات کو سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ تو ظاہر ہے
 کہ ہر فرد امتِ عربیہ کا اس کے جملہ الفاظ کے معانی اور اس کی تمام ترکیب کی تفصیلات کا عالم نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں وہ ایک سادہ مفہوم اس کا ضرور
 سمجھ لیتے تھے اور ہر ایک آیت کے تفصیلی معانی تک پہنچنے کی تکلیف لازمی خیال نہیں کرتے تھے لیکن اس سے یہ انداز کر لینا کہ وہ بالعموم آیات کے سرسری
 مفہوم پر قانع تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ابو عبد الرحمن سہری سنی سے روایت ہے کہ صحابہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھتے تھے تو جب تک ان کی علمی اور
 عملی حقیقت کو جان نہ لیتے تھے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ہم میں سے جب کوئی شخص سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیتا تھا
 تو ہماری نگاہوں میں محترم ہو جاتا تھا — حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں زیادہ تر آیات محکمات ہیں جو اصول دین اور احکام شریعت سے تعلق
 رکھتی ہیں یا انبیاء کرام اور اقوام سابقہ کے تجزیہ اور عبرت انگیز قصص ہیں ان کا سمجھنا جمہور کے لئے آسان ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ حقائق غامضہ بھی ہیں

والوں کو اللہ تعالیٰ نے اس گدھے سے تشبیہ دی ہے جس کی پشت پر کتابوں کا انبار لدا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ اس میں کیا ہے۔ اس کا واسطہ ان کتابوں سے بس اتنا ہی ہے کہ وہ انہیں لائے پھر رہا ہے —

یہ تمثیل اگرچہ یہود کی بیان کی گئی ہے لیکن معنوی حیثیت سے یہ ان لوگوں پر بھی چسپاں ہوتی ہے جنہیں قرآن دیا گیا ہے، مگر نہ وہ اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں نہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ نہ اس کے حقوق ادا کرتے ہیں، نہ اس کو قانون کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ ان کے ساتھ کمال اعتناء صرف اس قدر ہے کہ حریر و دیبا کے خوشنما جردانوں میں اسے لپیٹ کر طاقتوں پر رکھ دیا جائے اور بس تبرک کے لئے ان کی تلاوت کر لی جائے —

مشرکین کی حزنک اور کس مہر سانہ ہلاکت کی تمثیل :-

پس بُت پرستی کی نجاست سے دُور رہو اور دروغ گوئی سے بچتے رہو۔ ہر طرف سے کٹ کر صرف اللہ کے ہونے کو، اس کے ساتھ کسی کو شرک نہ کرو، اور جو خدائے واحد کے ساتھ شرک کرنا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ گویا وہ آسمان سے گر پڑا، پھر باتو اُسے پرندے اُچک لے جائیں گے، یا ہوا کسی دُور دراز مقام پر لے جا کر ڈال دے گی —

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ
الرُّزْوَۃِ ۚ حُنْفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرُ مُشْرِكِيۡنَ بِهِ ۚ وَمَنْ
يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ
فَتَخَطَّفَهُ الطَّيْرُ ۚ أَوْ ذُتْهُوۤىۡ بِهٖ الرِّجْزُ فِيۡ
مَكَانٍ يَّخِيۡفُ ۚ —

(حج - ۴)

اس تمثیل پر غور کرو اور دیکھو۔ اللہ کے ساتھ اغیار کو شرک کرنا البتہ کرنے والوں کے انجام اور حالات کی کیسی کامل تصویر ہے۔ اس تشبیہ میں دو پہلو ہو سکتے ہیں — (۱) اسے تشبیہ مرگب مانا جائے، یعنی مشتبہ اور مشتبہ بریں باہمی مطابقت ان کے ہر ہر جزو کی تنیت سے نہ ہو، اس صورت میں مشرک کی اس حالت کو، کہ اس نے خود اپنے ہاتھوں ہلاکت کا لیا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا ہے جس سے رہائی کی توقع ہی ناممکن ہے اس شخص کے حال اور انجام سے مشابہت دنیا مقصود ہوگا جو آسمان سے گر پڑا ہو اور فضا ہی سے پرندے اسے اُچک کر اس کی لٹکا ہوئی کھولے لگیں یا ہوا کے تیز تند جھونکے اسے اڑا کر کسی دُور دراز اور سنان مقام پر ڈال دیں جہاں زندگی کی بقا و حفاظت کی کوئی کوشش نہ ہو پس جس طرح اس شخص کی ہلاکت یقینی اور ناگزیر ہے اور اسے ہلاکت سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ اسی طرح توحید کے رشتہ کو چھوڑ کر کوئی شخص ہلاکت سے مفر نہیں پاسکتا —

(۲) اسے تشبیہ مضرِق مانا جائے جس میں مشتبہ اور مشتبہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مطابقت ہوتی ہے۔ اس صورت میں خالص انسانیت کے مقام کو جس کا فطری مقصد خدائے واحد کی بندگی ہے۔ اور جس کی خلقی رفعت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی مخلوق کے آگے سر نہ جھکایا جائے، آسمان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس سے اُدھر اللہ کا قبضہ ہے اور سب کچھ اس کے نیچے ہے۔ جو شخص خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا الہ اور رب اور خدا وند اور اُلّٰہ اور مالک امر و نبی بناتا ہے، یا خدا وندی میں دوسروں کو خدا کا شرک قرار دیتا ہے، اس کی حالت ایسی ہے کہ وہ گویا آسمان سے گر کر سخت الشریٰ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اب جو وہ اس پستی کی طرف چلا تو اس کے دو ہی انجام ہوں گے — یا تو وہ ان فاسق و ظالم حکمرانوں اور جھوٹے مذہبی پیشواؤں کے جھگڑ میں پھنس جائے گا جو اس کی بوئیاں شکاری پرندوں کی طرح نوح نوح کرکھائیں گے۔ یا پھر خود اپنی ہوائے نفس کے طوفان میں گھر جائے گا اور وہ اسے کہیں سے کہیں اڑائے لئے پھرے گی —

شرک کی نامعقولیت اور شرکاء کی بیچارگی کی مثال

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضَرْبٌ مِّثْلُ مَا تَتَّبِعُونَ اللَّهَ إِنَّ الَّذِينَ
تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا ذُبَابًا
وَلَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ إِنْ يَشَاءُ اللَّهُ ذُبَابٌ شَيْئًا
لَا يَسْتَفِيدُونَ مِنْهُ ط ضَعُفَ الطَّالِبُ
وَالْمَطْلُوبُ ه مَا قَدَّرَ اللَّهُ لِقَوْمٍ
قَدَرًا لَا يُغْنِي عَنْهُمْ قُوَّةُهُمْ

(ج - ۱۰)

اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے اسے غور سے سنو اللہ
کے ماسوا جن ہستیوں کو تم بحیثیت معبود لپکارتے ہو، وہ (اس قدر
عاجز و بیچارہ ہیں کہ) ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے وہ سب کے
سب بل کر ہی کیوں نہ پیدا کرنا چاہیں۔ اور اگر مکھی (جیسی ادنیٰ اور
بیچ مخلوق) ان سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اس سے اس چیز کو واپس
بھی نہیں لے سکتے۔ طالب اور مطلوب دونوں ایک جیسے کمزور
ہیں۔ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو پہچانا نہیں جیسا کہ پہچاننے کا حق تھا
بیشک الشُّرَکُوت اور غلبہ والا ہے۔ (اس کے علاوہ ساری موجودات
اس صفت سے بالکل محروم ہیں)۔

یہ مثال اس قابل ہے کہ ہر انسان اپنے قلب پر اس کو نقش کر لے اور اس کے معارف میں غرق ہو کر فلسفۃ الوہیت پر غور و فکر
کرے۔ اگر دل میں حق کی طلب ہوگی تو ناممکن ہے کہ وہ جمال و احدانیت سے مسحور ہوئے بغیر اس کی گہرائیوں سے واپس آئے۔ یہ تمثیل شرک
کی جڑ بنیاد کھود کر رکھ دینے والی ہے کیونکہ یہ ایک بدیہی اور مسلمہ حقیقت ہے کہ معبودیت کا کمتر سے کمتر درجہ یہ ہے کہ معبود اپنے بندوں کو
نفع پہنچانے اور ان سے نقصان کو دفع کرنے پر قادر ہو۔ ورنہ اگر وہ اپنے اندر اتنی بھی سکت نہیں رکھتا تو اسے کیا حق ہے کہ اپنی پرستش کرنے
اور لوگ اس کی پرستش کریں؟ لیکن مشرکین کے معبودوں کا کیا حال ہے؟ نفع و نقصان پہنچانے کی قدرت رکھنا تو بڑی چیز ہے
وہ غریب اتنے بے بس، اتنے لاچار اور اتنے عاجز ہیں کہ سب بل کر بھی ایک مکھی تک نہیں پیدا کر سکتے، اور پیدا کرنا تو درکنار اگر مکھی
جیسی کمزور مخلوق ان کے چڑھا لے میں سے کوئی چیز لے اڑے تو یہ کائنات کے "فرما زوا" اتنی قوت بھی نہیں رکھتے کہ اس سے اس چیز کو
چھین کر واپس لے لیں۔ اور اس سے اس گستاخی کا انتقام لیں، گویا ان سے بڑھ کر ضعیف اور عاجز و ناتواں ہستی کوئی نہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں
آتا کہ کوئی درست ہوش و حواس رکھنے والا انسان ایسی ہستیوں کے آگے سر جھکانے کو گوارا کس طرح کر سکتا ہے۔

یہ مثال شرک کی نامعقولیت اور مشرکین کی بے عقلی اور سفاہت پر ایک جگہ بالذکر کی حیثیت رکھتی ہے اس کا طرز استدلال قرآن
کے یلغ ترین استدلالات میں سے ہے اس کی روشنی میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیطان ان مشرکین کی عقلوں کو کس طرح الٹ دیتا اور کس حد تک
ماؤف بنا دیتا ہے کہ وہ پتھر کی بے جان مورتوں میں جن کی طافت اور قدرت کا یہ حال ہے کہ معمولی اور حقیر سے حقیر مخلوق کو بھی پیدا نہیں کر سکتیں،
حتیٰ کہ اگر حقیر ترین مخلوق ان کی جناب میں گستاخی کر کے کوئی چیز سامنے سے اُچک لے جائے تو سب کی سب بل کر بھی اسے چھڑا کر واپس نہیں لے
سکتیں، ایسی بے جان اور بے حقیقت مورتوں میں عقل کے دشمن الوہیت جیسی چیز کا جلوہ دیکھتے ہیں اور انہیں معبود اور اللہ سمجھ کر ان کے سامنے
پیشانیاں لیختے ہیں۔ حالانکہ معبود اور اللہ کی معبودیت والوہیت کا ابتدائی اور بنیادی تقاضا یہ اس نے ساری مخلوقات کو پیدا کیا ہو، قادر مطلق ہو
ہمہ دان ہو، سب سے بے نیاز ہو، سب کا بلحا و مرجع ہو، فریاد رس اور معدلت گمتر ہو۔

اس حقیقت کے افہام کے بعد کہ الوہیت کے مقام اور اہنام کی حیثیت میں کتنا بعد المشرقین ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ ۱۔
ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ یعنی عاجز و معبود دونوں یکساں ضعیف اور ناتواں ہیں۔ یہ تفسیر ان لوگوں کی ہے جن کا خیال ہے کہ یہاں طالب

مُراد عابد اور مطلوب کے مُراد معبود ہے، یعنی ایک عاجز۔ دوسرے عاجز۔ جسے چشمِ اُمید رکھتا ہے یا پیسا پیسا سے پانی مانگ رہا ہے اور یہ کتنی بڑی نادانی ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں سائب اور سلوب کی یکسانی دکھائی گئی ہے، یعنی معبودانِ باطل اور مکھی دونوں ضعف و بیچارگی کے لحاظ سے برابر ہیں۔ اس تاویل کی رُو سے طالب وہ بُت ٹھہرے اور مطلوب مکھی جو ان کا چڑھا دالے اُڑی ہو۔ ایک تیسری تاویل اور بھی ہے جو دوسری کے بالکل برعکس ہے، ہمارے نزدیک لفظ کی وسعت اور عمومیت ان سب تاویلات پر محیط ہے اور ضعف کی نسبت عابد معبود (بُت) اور سائب (مکھی) سب کی طرف ہے۔ پس ایسی ضیعت سہتی جو اپنی ہی طرح بے دست و پا ہو، اپنا مسجود اور الشّر قادر کا شریک قرار دینے والا درہل الوہیت کے تصور سے عاجز ہے اور معبود کے علو و کمال کا درہل کوئی احساس نہیں رکھتا۔ ورنہ اس سے یہ ظلمِ عظیم ہرگز سرزد نہ ہوتا —

کُفار کے پتھر جیسے سخت دلوں سے حق کی آواز ٹکرا کر کس طرح ناکام واپس آتی ہے، اس کی مثال۔

کُفار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک ایسی چیز کو پکارتا رہا ہو جو پکارنے اور بھلانے کی آواز کے سوا کچھ نہیں سُنتی (یعنی پکارنے والے کا مطلب بالکل نہیں سمجھتی) یہ کافر لوگ رے گونجے ٹھہرے اور اندھے ہیں جو کچھ سمجھ بوجھ نہیں رکھتے —

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ
بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً مُّصَوِّ
بِكُفْرِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝
(البقرہ - ۱۷۱)

”لحقیقہ۔ چرواہے کی اس آواز کو کہتے ہیں جسے وہ گائے کو پکارنے اور بھلانے کے وقت اپنے مُنہ سے نکالتا ہے۔ تجزیہ کرنے سے اس تشبیہ میں مشتبہ کے دو اجزاء اور افراد نکلتے ہیں۔ ایک ناسمجھ یعنی چرواہا۔ دوسرا منعوق بہ یعنی گدہ۔ رہ گیا یہ امر کہ چرواہے اور گدے تشبیہ کس چیز کو دی گئی ہے۔ سو اس بارے میں علماء تفسیر کے چند مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول کے مطابق ناسمجھ سے مُراد بُت پرست ہے جو اپنے بُتوں کو بوقت احتیاج بھلاتا ہے اور ان سے دعائیں مانگتا ہے۔ اور منعوق بہ سے مُراد وہ بُت ہیں جنہیں اس کے چڑھاری بھلاتے ہیں۔ اس تاویل کے لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ بُتوں کو بھلاتے اور ان سے دعائیں اور منتیں مانگتے وقت کُفار کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جو اپنے جانوروں کو چلا چلا کر بھلاتا ہے اور وہ اس کی آواز کو سمجھتے تک نہیں۔ عبدالرحمن ابن زید وغیرہ کا یہی خیال ہے —

علامہ زعزعی اور دوسرے بہت سے اہل تفسیر نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ”إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً“ کے الفاظ اس تاویل کا کئی طرح ساتھ نہیں دیتے، کیونکہ بُت تو مطلقاً کسی آواز یا پکار کو سُنتے ہی نہیں اور آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اگر منعوق بہ پکارنے والے کی بات کو سمجھتا تو نہیں مگر سُنا ضرور ہے۔ لہذا یہاں بُتوں کو مشتبہ نہیں قرار دیا جاسکتا —

اس اعتراض کے تین جواب دیئے گئے ہیں: —

ایک یہ کہ اس جگہ لفظ ”إِلَّا“ زائد ہے اور آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”کُفار کی مثال اس شخص کی ہے جو کسی ایسی چیز کو پکارتا رہا ہو جو پکارنے اور بھلانے کی آواز تک نہیں سُنتی“ ظاہر ہے کہ یہ کسی قدر بھپسا اور غلط جواب ہے۔ قرآن کی تفسیر اگر اس انداز سے کی جائے کہ جس لفظ کو جہاں چاہا زائد کر دیا، اور جس کو جہاں ضرورت سمجھی محذوف قرار دے دیا۔ تو قرآن تو باز سچے اطفال بن جائے گا۔ اور تحریف معنوی کا دروازہ روز بروز وسیع سے وسیع ہوتا جائے گا — دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں تشبیہ میں پیش نظر محض دُعَاء (بھلانا اور آواز دہنا) ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ

بلانے کا انجام دونوں جگہ یکساں ہے۔ اس جگہ مدعو کی (یعنی جس کو بلا یا گیا ہو، اس کی) خصوصیات سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے اگر مشبہ میں ایک ایسی زائد صفت اور خصوصیت پائی جائے جو مشبہ میں موجود نہیں تو اس سے نفس تشبیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسرے خواب کی زد سے آیت کی توضیح اس طرح ہو گی کہ ایسے خود ساختہ معبودوں سے، جن کو احساس تک نہیں ہوتا کہ انہیں مخاطب کئے کوئی کیا کہہ رہا ہے، دعائیں مانگنے والوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے ریوڑ کو بلاتا اور پکار رہا ہو اور اس پر اس کے بلانے اور چلانے کا کوئی اثر نہ رہا ہو اور اس کی ساری چیخ پکار کا حاصل صرف یہی ہوتا ہو کہ بس وہ بلائے جا رہا ہے۔ یہی منکر کا حال ہوتا ہے جبکہ وہ اپنے گونگے بہرے خداؤں کو گڑگڑاتا، گڑگڑاتا کرتا ہوتا ہے۔ اور گڑگڑاتا اور دعائیں مانگنے کی محنت مشقت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ کفار کی مثال ان بہائم کی سی ہے جو چرواہے کی پکار کا مطلب بالکل نہیں سمجھتے۔ صرف اتنا محسوس کرتے ہیں کہ اس کے حلق سے آواز نکل رہی ہے یعنی اس تاویل کے قائلین کے نزدیک راعی سے مراد پیغمبر ہے جو کفار کو حق کی طرف بلاتا رہا ہے مگر ان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ سیویہ نے — آیت کی تشریح اسی طرح کی ہے —

اس تمثیل کو تشبیہ مرکب بھی مانا جاسکتا ہے اور تشبیہ مفرق بھی۔ پہلی صورت میں مدائے حق کو نہ سمجھنے اور اس سے فائدہ نہ اٹھانے والے کفار کی تشبیہ دینی مقصود ہو گی اس گم سے جو چرواہے کی پکار کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ وہ کچھ بول رہا ہے اور اگر اسے تشبیہ مفرق مانا جائے یعنی وہ تشبیہ جس میں مشبہ اور مشبہ بہ کے تمام متقابل اجزاء میں مماثلت اور مشابہت ضروری ہوتی ہے تو اس صورت میں کفار بمنزلہ بہائم کے ہونے اور دعوت حق بمنزلہ نفعیق (جانوروں کو بلانے کی آواز) کے ہونے اور ان کفار کا اس دعوت حق کو مدائے محض سمجھنا بمنزلہ ادراک بہائم کے ہونے کا جو چرواہے کے بلانے اور پکارنے کی آواز کو ایک بے معنی آواز سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

انفاق فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل الطاغوت کی مثال۔

جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں ان کی (خیرات کی) مثال اس دانے کی سی ہے جس میں سات خوشے اور ہر خوشے میں سو دانے پیدا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے برکت عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت اور قدرت رکھنے والا نیز ہر شے باخبر ہے۔

... اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اس کی (کو) ایذا دے کر اکارت نہ کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر لاٹھیاں (سی) مٹی پڑی ہو، پھر اس پر تیز بارش ہو اور (مٹی کی) کسی ٹپکی سی نہ کوہا چٹان کو چٹنی اور سپاٹ کر کے چھوڑ دے (یہی انجام ہے ریا کار صدقہ دہندوں کا قیامت میں) یہ لوگ اپنے دیئے ہوئے صدقات میں سے کچھ نہ حاصل کر سکیں گے اور اللہ ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ
كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَتَتْ سَنَابِلَ فِي كُلِّ
سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ
لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَسِعٌ عَلِيمٌ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَاتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ
رِيشَاءَ الْمَنَاسِرِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ
الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَةٍ
تُؤَابِقُ فَاصَابَهُ وَابِلٌ فَتَمَرُّكَهُ صِلْدًا
لَّا يَقْدِرُ دُونََ عَلَىٰ شَيْءٍ فَمَا كَسَبُوا
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَلْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ
أَصْبَحَ نَبْهًا وَّأَيْلٌ فَاتَتْ أَكْثَرُهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن
لَّوِيصِبْهَا وَآبِلٌ فَطَلَّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
بَصِيرٌ أَيْوَدُ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ
جَنَّةٌ مِّنْ خَبِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ
تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ
وَإَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّتٌ ضِعْفًا
فَأَصَابَهَا إِعْصَابٌ فِيهِ نَاسٌ فَاحْتَرَقَتْ
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُونَ —

(بقرہ-۶۳۶)

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال خرچ کرتے ہیں محض خدا کی رضا جوئی
کے لئے نیز خلوص اور ثبات قلبی کے ساتھ، ان کی خیرات کی
مثال ایک باغ کی سی ہے جو ٹیلے پر واقع ہے، پھر اس زور کا مینہ
برسا اور (عام انداز سے) دو گنا پھل لایا اور اگر اس پر زور کی بارش
نہ بھی ہوئی تو اسے ٹی پھوار (بھی بس کرتی ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے
سائے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا
کہ اس کے پاس مہجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے
نیچے نہریں بڑی بڑی بہ رہی ہوں، اس میں ہر قسم کے میوہوں اور بڑھاپا
اُسے آئے، اور اس کے چھوٹے چھوٹے ناتواں بچے ہوں (ایسی حالت
میں) باغ پر تیشیں بگولا چلے اور وہ جل بھن کر رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ
اپنی آیات تمہارے لئے یونہی کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ
تم غور کرو —

یہ ایک مفصل تشیل ہے جس میں انفاق لوجہ اللہ اور انفاق ریائی دونوں کی حقیقت اور دونوں کے انجام اور ثمرات کی تصویر کھینچی گئی ہے
پہلے انفاق فی سبیل اللہ کے انجام کی مثال دی گئی ہے کہ خدا کی راہ میں۔ خواہ جہاد میں یا کسی نیک کام میں خرچ کرنے والے کی مثال اس شخص کی
سی ہے جو زمین میں بیج ڈالتا ہے اور ہر بیج سے سات خوشے پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر سو سودا نے ہوتے ہیں۔ گویا ایک دانہ
بوکر سات سو ماہل کرتا ہے، اللہ کے لئے مال قربان کرنے والا یونہی اپنا مال ضائع نہیں کرتا بلکہ درحقیقت کمی بخٹا ہے۔ اس بڑھوتری کا
انحصار خرچ کرنے والے کے خلوص اور ایمان پر نیز مال کی نافعیت اور حقدار کی حیثیت پر ہے، کیونکہ صدقہ کا ثواب صدقہ دینے والے کی قلبی
کیفیت کے لحاظ سے متفاوت ہوا کرتا ہے۔ نیت ایک میزان ہے جس پر ہر عمل کا وزن کر کے اس کا بدلہ متعین کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ
تعالیٰ نے آگے چل کر اس انفاق کی، جس کی ثواب عدد مذکورہ تک پہنچنے والا ہے، یعنی کمال انفق کی دو صفتیں بیان کی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ
محض اللہ کے لئے ہو، شہرت پسندی اور ریاکاری کا اس میں شائبہ نہ ہو۔ دوسری صفت تَثْبِيتٌ مِّنْ أَلْفُسِهِمْ کی ہے۔ تثبیت کا
مطلب یہ ہے کہ صدقہ خیرات دینے والا صدقہ نکالتے وقت دل میں کمی قسم کی تنگی نہ محسوس کرے بلکہ کھلے دل سے اور ثبات قلب کے ساتھ دے اور مال
کو اپنے ہاتھ سے نکلانے سے پہلے اپنے دل سے نکال دے۔ یہی تثبیت نفس ہے جو اموال خیرات کی مقدار اور نوعیت کے ساتھ بل کو خیرات
کی قدریں مقرر کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سیکڑوں گنا زیادہ معاوضہ تک پہنچ جاتی ہیں —

اس کے بعد یہ دیکھو کہ اس صدقہ کی حقیقت کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معنویت کو کس طرح مشہود کرایا ہے۔ سو پہلے تو اللہ نے صدقہ
کو بیج سے تشبیہ دی ہے، گویا اپنے پاک مال کو بغیر کسی دوسرے جذبہ کے خلوص دل سے خدا کی راہ میں خیرات کرنے والا ایک کسان ہے جو اپنے
مال کو عمدہ اور صاف زمین میں بوتا ہے۔ اب پیداوار کا کم و بیش ہونا بیج کی عمدگی، زمین کی زرخیزی، پودوں کی آبپاشی اور خود زود گھاس پات
سے ان کی حفاظت پر منحصر ہے۔ اگر یہ تمام لوازم بدرجہ کمال موجود ہو جائیں اور کھیتی پر کسی قسم کی اربابی یا سادہی آفت نہ آئے تو وہ نہایت شاداب اور
زوردار ہوگی۔ اور اس کی مثال اس باغ کی سی ہوگی جو اونچی زمین پر واقع ہے جہاں اسے ہر وقت کھلی ہوا، دھوپ اور روشنی مل رہی ہے اور اس کے
درخت پوری آزادی کے ساتھ نشو و نما حاصل کر رہے ہیں، پھر اگر بہار آتا ہے اور جی کھول کر اسے سیراب کرتا ہے، انجام کار اس کے درخت دوسرے

درختوں کی بہ نسبت دو چند پھل لاتے ہیں اور اگر موسلا دھار بارش نہیں ہوتی تو ہلکی سی بارش بھی اس کے لئے کافی ہوتی ہے کیونکہ اس کی زمین اپنے اندر روئیدگی کی کامل استعداد رکھتی ہے —

یہی حال اس صدقہ کے نشوونما اور اس کی برومندی کا جو غلوں اور لذتیت کی مقدس زمین میں بویا جاتا ہے۔ اسبابِ نو کے تغاؤ کے لحاظ سے اس کے حاصل میں بھی تغاوت ہوتا ہے۔ وابل (زور کا میدان) اور صلل (ہلکا میدان) کے الفاظ اسی تغاوت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض صدقے وابل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور بعض صلل کی۔ جو عیسار اور فدا میں دے گا ویسا ہی وہاں سے اجر بھی پائے گا —

اس کے برعکس معاملہ ہے اس شخص کے انفاق کا جو خرچ تو کرتا ہے۔ لیکن بے فائدہ جس کا کوئی حاصل نہیں، یعنی خدا کے لئے اذیت نفس کے ساتھ نہیں دیتا، بلکہ شہرت طلبی اور ریاکاری کے جذبہ کے ماتحت دیتا ہے، انجام کار اس کا سارا دیا دلا یا اکارت جاتا ہے ایسے شخص کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس بد بخت اور حسرت نصیب انسان سے دی ہے جس کے پاس کھجور اور انگور کے بیش قیمت باغات ہوں جس کے نیچے نہریں پڑی ہو رہی ہوں اور اسے برابر سیراب و شاداب رکھتی ہوں۔ ہر قسم کے پھل لگے ہوئے ہوں اور وہ خود کہن سالی کی عمر کو پہنچ چکا ہو، اس کی اولاد و خرد سال اور ناتواں ہو یعنی نہ خود کمانے کی سکت رکھتا ہو اور نہ بچے اس قابل ہوں۔ ایسی حالت میں جب کہ وہ باغ کی برومندی کا سخت حاجت مند ہے — لوؤں کی لپٹ آئے اور سارے باغ کو جھلس کر خشک کر دے۔ بالکل یہی حال اس شخص کا جو کھالے کے لئے اپنا مال خیرات کیا کرتا ہے۔ ابھی تو اپنی فیاضی کے غرور میں سرسبز ہے لیکن جب اس فیاضی کی قیمت معلوم ہونے کا وقت آئے اور دائرِ محشر کے سامنے اس کا اعلانِ مرقع ہوا جائے گا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی کہ جس کشتِ عمل کی شادابی اور فروزی پر وہ اس قدر نازاں تھا اور اس پر اعتماد کئے بیٹھا تھا، مگر اس وقت جبکہ وہ اس کے ثمرات کا سخت حاجت مند ہے ساری کھیتی ہل کر خشک ہو چکی ہے، اور مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ اب دوبارہ جمعہ تبونے کا موقع بھی نہیں۔ وجہ مشابہت دونوں کے انجام میں مشابہت ہے، یعنی شدید امتیاج کے وقت نعمت کا چھین جانا، آرزوؤں کا تاراج ہو جانا اور ہیبت ناک حسرتوں سے دوچار ہونا —

اس امر میں کہ یہ مثال کس شخص کی دی گئی ہے، بعض دوسرے اقوال بھی مذکور ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس شخص کی مثال ہے جس کا فائدہ فساد انگیزی اور فتنہ پردازی پر ہوا ہو، امام مجاہدؒ کا قول ہے کہ یہ اس شخص کے حالات کی تمثیل ہے جو زندگی بھر طاعت الہی میں کوتاہیاں کرتا رہا، سستی کے نزدیک یہ اس ریاکاری کی تشبیہ ہے جس نے خدا کی رضا جوئی کو نظر انداز کر کے داد و دہش کی ہو۔ یوں تو آیت کے عموم میں ہر قول کی سمائی ہے۔ لیکن سیاق و سباق آخری قول کی ہی تائید کرتا ہے —

اس تمثیل کا ایک حصہ اب اور باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی صدقاتِ باطلہ کی مثال۔ صدقات کو باطل کرنے والے امور دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو صدقات کو ذریعہٴ ثواب اور علتِ ثواب بننے ہی سے روک دیتے ہیں۔ مثلاً ریا اور نام و نمود کی خواہش، دوسرے وہ امور جو صدقات کو ذریعہٴ ثواب بننے سے تو نہیں روکتے لیکن اس ثواب کو باطل اور معدوم کر دیتے ہیں جو ان صدقات کے عوض ملنا چاہیے تھا، مثلاً احسان جتنا، یا سائل کو ایذا دینا۔ ایسے صدقات کی مثال اللہ تعالیٰ نے اس سخت اور سپاٹ چٹان سے دی ہے جس پر مٹی کی ایک ہلکی سی تھاکر جم گئی ہو، پھر تیز بارش آئے اور مٹی کی اس تھاکو ہمارے جٹان کو کھلی ہوئی سپاٹ مالت میں چھوڑ دے۔ اس تمثیل کے اجزاء اور تشبیہ کے اجزاء کے ساتھ ان کے تطابق کو دیکھو، قرآن کی شانِ عظمت اور اس کے اعجازِ بیان کا کیسا روشن آئینہ ہے۔ اللہ کی خوشنودی کو چھوڑ کر دنیوی جاہ و نمود پر اپنا مال قربان کرنے والے یا خیرات کر کے احسان جتنے اور مسائل کو تکلیف دینے والے آدمی کے قلبِ ناآشنائے اخلاص کو پتھر سے اور اس کے عمل کو جٹان پر جمی ہوئی مٹی سے تشبیہ دینے میں کتنے لطیف نکات پہنچا دیے، پتھر کی سختی مٹی کو اپنے اندر پانی جذب نہیں کرنے دیتی اور نہ اسے روئیدگی کی اجازت دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی فطرت میں یہ مادہ ہے ہی نہیں۔ کہ بارش ہونے کے بعد مٹی کے ذرات کو اپنے سے ٹٹانے

رکھ کے اور انہیں پانی اور روئیدگی قبول کرنے کا موقع دے سکے، معمولی زمین کے لئے تو بارش سبب روئیدگی ہے مگر چٹان پر جمی ہوئی مٹی کے لئے بارش ہونے کے معنی یہی روئیدگی بھی ضائع ہو جانے کے ہیں، اسی طرح جو قلب غلوس، لہیت اور ایمان و اخلاص سے عاری ہوتا ہے اور محض نمائش کے لئے فیاض بن رہتا ہے، جب اس پر آسمان شریعت سے ادا مردنواہی کی بارش ہوتی ہے تو وہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔ اور انہماکِ عباد کی ہلکی سی وہ تہ بھی، جو اس پتھر پر قلب پر نقاب بن کر پڑی ہوئی تھی، اس بارش کے ریلے میں نہ جاتی ہے اور اس کا دل اپنی اصلی ہیئت میں ایک سپاٹ پتھر کی طرح لگا ہوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے جس میں نشوونما کی کوئی استعداد نہیں ہوتی۔

کلمہ طیبہ (علم حق) اور کلمہ خبیثہ (علم باطل) کی مثال :-

کیا تم نے اس بات پر دھیان نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے (کلمہ طیبہ) کی کسی مثال دی ہے "کلمہ طیبہ" ایک اچھی ذات کے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط زمین کے اندر جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان میں ہیں اور جو اپنے پروردگار کے حکم سے ہمہ وقت پھل لاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے یہ مثالیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ (حقائق کا) احساس کریں اور "کلمہ خبیثہ" کی مثالیں اس (ناکارہ اور) بد اصل درخت کی سی ہے جو (بآسانی) زمین کے اوپر سے اکھڑ آئے (اور اسے کوئی جہاد اور مضبوطی حاصل نہ ہو)۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أَكْثَرَهَا ثَمَرًا حِينَ يَدُورُ رِيحًا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ هـ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ انْجَثَّتْ مِنْ ثَوْتٍ أَوْ نَضِبَ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ هـ

(ابراہیم ۲۴)

یہ دو متقابل مثالیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے فطری جوہروں کو مشاہدہ کرنے کے لئے بیان فرمایا ہے۔ ہم ان دونوں مثالوں کی الگ الگ تشریح کریں گے۔ پہلی مثال میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ "کلمہ طیبہ" ایک عمدہ درخت کے مانند ہے۔ وجہ مشابہت باطل و طیبہ ہے۔ کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے پھل نکلتے ہیں جس طرح کہ عمدہ درخت سے کارآمد اور عمدہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ جمہور مفسرین کے اقوال سے یہی تاویل مفہوم ہوتی ہے جن کا خیال ہے کہ کلمہ طیبہ سے مراد کلمہ شہادت لا اِلهَ اِلَّا اللہ ہے، کیونکہ یہی کلمہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال صالحہ کا سرچشمہ ہے اور ہر نیک عمل اسی کلمہ کا ثمرہ۔

علی ابن ابی طلحہ نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ کلمہ طیبہ شہادت توحید ہے اور شجرہ طیبہ ذاتِ مومن۔ اصلہا ثابت ہے "کا مطلب یہ ہے کہ قول لا اِلهَ اِلَّا اللہ مومن کے قلب میں جرد پکڑے ہوئے ہے اور "فرعہا فی السماء" کنایہ ہے اس امر کی طرف کہ یہی کلمہ شہادت مومن کے اعمال کو عرشِ الہی تک پہنچاتا ہے۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ کلمہ طیبہ سے مراد ایمان ہے۔ یہاں ایمان ہی کو شجرہ طیبہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور اصل ثابت سے مقصود اخلاص ہے۔ اور ایمان و اخلاص سے جو خوفِ خدا پیدا ہوتا ہے اس کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے والی شاخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ کلمہ طیبہ کی تاویل ان دونوں اقوال میں ایک ہی ہے لیکن، عام خیال میں پوری تمثیل کی یہ آخری توضیح زیادہ صحیح ہے۔ اس تشریح سے تشبیہ میں کفلی ہوئی مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا حسن بالکل نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ مشبہ وہ شجر توحید ہے جو مومن کے دل میں اگل رہا ہے اور مشبہہ عمدہ اور پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑ نہایت مضبوط ہو، جس کی شاخیں آسمان سے باقی کرنے والی ہوں اور جو برابر پھل دینے لگے گا ہوں۔

غور کر گئے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام صفات "شجر توحید" میں کس طرح پائی جاتی ہیں۔ اس کی جڑیں قلبِ مومن کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوتی ہیں اس کی شاخہائے اعمال صالحہ آسمانوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اور وہ ہر آن، ہر لحظہ نیکیوں کے اتنے ہی زیادہ پھل لاتا رہتا ہے جتنا زیادہ اس کی جڑوں میں ثبات ہوتا ہے۔ یعنی جتنا ہی زیادہ اس (شہادتِ توحید) میں اخلاص اور اذعان ہوتا ہے۔ اور جتنا ہی زیادہ قلب کو اس کے جمال سے عشق، اس کے حقائق کی معرفت اور اس کے مقتضیات کی برآری کا لحاظ رہتا ہے۔ اتنے ہی زیادہ اس سے نیک افعال صادر ہوتے ہیں۔ پس جس شخص کے قلب میں یہ کلمہ طیبہ اپنی کامل حقیقت کے ساتھ جم گیا اور جس کا باطن اس کے لاہوتی رنگ میں پوری طرح رنگ کیا۔ یقین کر و کہ وہی اس ماہیتِ الوہیت کا حقیقی راز دان ہے جس کا شہین یہی قلبِ مومن ہوا کرتا ہے۔ پھر نہ صرف اس کی زبانِ واحدانیت کی گواہی دیتی ہے بلکہ اس کے سارے جوارح سے توحید کی شہادت تراویں کرنے لگتی ہے۔ اس کے بعد وہ اس ماہیت (یعنی مقامِ الوہیت) اور اس کے تمام لوازم کی غذا کے سوا ہر دوسری چیز سے نفی کر دیتا ہے اور ساری مخلوق کو اپنا ہی جیسا ہیچ اور مجبور محض سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت دنیا اپنی لگا ہوں سے صاف طور پر دھکتی ہے کہ یہ کلمہ طیبہ جو اس کے دل پر نقش ہے اور جس کا اس کی زبان سے ہر وقت اعلان ہوتا رہتا ہے کس طرح دم بدم نیکیوں کے حیات آفریں پھل دیتا رہتا ہے۔ ایسی نیکیاں جو برابر اللہ کے حضور میں پہنچتی رہتی ہیں، گویا یہی کلمہ طیبہ ان اعمال کو بارگاہِ الہی میں پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ پھر یہی کلمہ بہت سے دوسرے کلمات طیبہ پیدا کرتا ہے جن کے ساتھ مزید نیک اعمال ظہور میں آتے ہیں۔ اور یہ نیک اعمال ان کلمات طیبہ کو اٹھا کر حضورِ الہی تک جاتے ہیں۔ جیسا کہ ذیل کی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر-۲) | اللہ ہی کی طرف کلمہ طیبہ (یعنی اچھی بات) پہنچتا ہے۔ عمل صالح اسے اٹھاتا ہے اور بلند کرتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ عمل صالح ہی کلمہ طیبہ کو عرش تک پہنچاتا ہے۔ اور مثال زیر بحث میں اتنی بات اور فرمادی ہے کہ یہی کلمہ مومن سے اچھے اعمال کو آتا ہے۔ اب دونوں آیتوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھو، مقصودِ الہی بالکل روشن ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ توحید کی اصل سپرٹ کو سمجھ جاتا ہے اور اس سمجھ جانے کا اثر اس کی عملی زندگی میں نمایاں ہو جاتا ہے تو بس یوں سمجھو کہ یہ کلمہ ایک ایسے درخت کی طرح ہے جس کی جڑ اس کے قلب میں مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمانی کناروں تک جا پہنچتی ہیں اور وہ درخت برابر پھلتا رہتا ہے۔ "شجرہ طیبہ" کی تاویل میں سلف کے مختلف اقوال مذکورہ ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ شجرہ طیبہ سے مراد کھجور کا درخت ہے اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے۔

ایک جماعت کا خیال ہے کہ شجرہ طیبہ خود ذاتِ مومن ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور عطیہ العونی وغیرہ اکابر کی یہی رائے ہے۔ لیکن دراصل دونوں قولوں میں اختلاف نہیں۔ نفس تشبیہ پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ برکات کے لحاظ سے مومن اور کھجور کے درخت کو ایک دوسرے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر کھجور کا درخت شجرہ طیبہ ہو سکتا ہے تو مومن کا وجود بدرجہ اولیٰ ہو سکتا ہے۔ اس لئے مشبہ بہ خواہ اسے قرار دو خواہ اسے مقصود تشبیہ میں کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

ایک تیسرا قول یہ بھی ہے کہ یہ شجرہ طیبہ جس کا ذکر مثال زیر بحث میں ہوا ہے جنت کا ایک درخت ہے اگر یہ صحیح ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تشبیہ کا مقصد اس سے بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس مثال کے اندر اسرارِ وحمت کا جو بیش بہا خزانہ پوشیدہ ہے وہ بس اسی مرکزِ علم و حکمت ہی کا حصہ ہے جس نے اسے بیان فرمایا ہے۔ آؤ! اس کے بعض محاسن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

درخت میں چار چیزوں کا وجود ضروری ہے۔ جڑ، تنا، شاخیں اور پھل۔ شجرِ ایمان کے اندر بھی ان چاروں چیزوں کا وجود ہونا چاہیے تاکہ مشبہ اور مشبہ بہ میں کامل مطابقت ظاہر ہو سکے۔ سو علم و معرفت اور اذعانِ قلب و شجرِ ایمان کی جڑ ہے۔ اخلاص اس کا تنا ہے۔

اعمال اس کی شائیں ہیں اور پھل وہ اخلاقِ حسنہ اور وہ صفاتِ حمیدہ ہیں جو ان اعمالِ صالحہ کے کرنے سے لازمی طور پر فطرتِ انسانی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ انہیں تمام اشیاء کا لحاظ کر کے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کس آل میں ایمان ہے اور کس میں نہیں اگر کسی کے اندر یہ تمام چیزیں موجود پائی جائیں، یعنی اگر اس کا علمِ عالم الغیب کی نازل کردہ کتابوں کے مطابق ہے، اگر اس کا اعتقاد اس معیار پر صحیح آتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبانی بیان فرمایا ہے، اگر اخلاص کا نور اس کے دل میں موجود ہے اور اعمالِ ان اشیاء مذکورہ کے اقتضائے موافق صادر ہو رہے ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ ایمان کا شجر مبارک اس کے قلب میں اگا ہوا اور تروتازہ ہے جس کی جڑیں مضبوط اور جس کی ٹہنیاں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اگر معاملہ برعکس ہو تو یقین کر لینا چاہیے کہ اس کے قلب کی سطح پر جو درخت لگا ہوا ہے وہ ایک ناکارہ اور بے جان درخت ہے جس کی جڑوں میں کوئی دم نہیں اور جو ایک جھٹکے میں اکھڑ جائے والا ہے۔

پھر یہ دیکھو کہ کوئی درخت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی آبیاری نہ ہوتی رہے۔ پانی دینا چھوڑ دو کچھ دنوں میں خشک ہو جائے گا۔ شجرِ اسلام کا بھی یہی حال ہے۔ انسان اس کی باقاعدہ دیکھ بھال نہ رکھے اور برابر تہہ و تفکر اور علمِ نافع اور عملِ صالح سے اس کی آبیاری نہ کرتا رہے تو اس کی شادابی حیاتِ آج نہیں توکل ضرور ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ مسند امام احمد بن حنبل میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: —

”ایمان کپڑے کی طرح پڑنا ہو جایا کرتا ہے۔ لہذا اپنے ایمانوں کو نیا (تازہ) کرتے رہو۔“

یہیں سے یہ نکتہ بھی سمجھیں کہ انسان کی حیاتِ ایمانی کے لئے ان موقت اور بہیم عبادت کی کمی شدید ضرورت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا ہم پر احسان ہے کہ اس نے اس شجرِ توحید کو تروتازہ رکھنے کے لئے اس کا سامانِ بہیم پہنچایا ہے جس کی کاٹ اس نے ہمارے قلوب میں کر رکھی ہے۔ — اچھے باغ یا عمدہ زراعت حاصل کرنے کے لئے قدرت کا یہ مقررہ قانون ہے کہ اسے بیگانے پودوں سے پاک صاف ہونا چاہیے۔ اگر مالی اپنے باغ کو یا کسان اپنی کھیتی کو ایسے پودوں اور گھاسوں سے محفوظ رکھتا ہے اور انہیں کھود کھود کر پھینکتا رہتا ہے تو اس کا باغ پوری طاقت کے ساتھ بڑھے گا اور پھلے گا۔ اس کے پودوں کو کامل روئیدگی حاصل ہوگی۔ اس میں نہایت کثرت سے عمدہ اور پاکیزہ پھل آئیں گے، لیکن اگر وہ ایسا کرنا چھوڑ دے تو خود رو پودے اور بیگانہ جھاڑ جھنکار سارے باغ میں پھیل جائیں گے۔ زمین کی قوتِ نمو کو مدد دے گا تو پھل آئیں گے اور کسان کا اصل مقصد یعنی پاکیزہ پھل لانے والے درخت غذا کی کمی کی وجہ سے بے جان اور پژمردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ان میں اول تو پھل آئیں گے ہی نہیں اور اگر پھل آئے تو بہت آگے بھی تو ناقص اور ناکارہ ہوں گے، چنانچہ جو کہ فسادِ نامحسوس کا بارِ عجبان اس بات کو نہیں سمجھتا وہ بڑے گھائے میں رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پس مؤمن کو ہمیشہ دو باتوں کی سعی کرنی چاہیے۔ ایک تو یہ کہ اس شجرِ ایمانی کو برابر پانی دیتا رہے۔ دوسری یہ کہ اس کے ماحول کو شجرِ خبیثہ سے پاک صاف رکھے، پانی دینے ہی میں اس کی بقا اور دوام ہے اور دیکھ بھال ہی اس کی بقا اور دوام ہے اور دیکھ بھال ہی اس کے کمال نشوونما دار تقاضا کی ضامن ہے۔ —

یہ ان اسرارِ وحکم کے بعض پہلو ہیں جو اس پر معنی تیش کی جدول میں چھپے ہوئے ہیں اور غالباً اُس سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس کی گہرائیوں میں مستور ہے اور یہ ہمارے اذہان کی نارسائی، ہمارے قلوب کی بے لوری، ہمارے علوم کی کوتاہی اور ہمارے اعمال کی بے برکتی کا تصور ہے کہ ہم اس سے زیادہ اپنے ظرف میں نہیں لے سکتے، ورنہ اگر ہمارے دل میں روشنی، ہماری ردیوں میں پاکیزگی، ہمارے ذہنوں میں جلال اور ہمارے اعمال میں خلوص ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول سے حقیقت کے انوارِ افندہ کو اپنے دل کی صلاحیت رکھتے ہوں تو یقیناً کلامِ الہی کے وہ اسرار و معارف ہم پر منکشف ہو جائیں گے جن کی تابانیوں کے سامنے یہ سارے رسمی علوم اور یہ ساری دنیوی قال اور اقوال ماند پڑ جائے۔ یہی وہ نعمت ہے جو صحابہ کرام کو نصیب ہوئی اور دوسرے اس سے محروم ہیں۔ اور اسی سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے

علم و عرفان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَّشَاءُ —

دوسری مثال میں دراصل پہلی ہی مثال کا قابل پہلو و انشعاب کیا گیا ہے کہ ”کلمۃ طیبہ“ کے مقابل میں ”کلمۃ خبیثہ“ کی کیا اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ کلمہ اس خیرِ خبیث کے مشابہ ہے جو معمولی جھٹکے میں اکٹھا ہونے والا ہو جس میں نہ کوئی مضبوط جڑ ہو نہ بلند و بالا شاخیں ہوں، نہ اچھے پھل ہوں، نہ سایہ، نہ سبزہ ہو۔ غرضیکہ ہر سے پاؤں تک اس اندر کوئی حسن و خوبی اور کوئی خیر و منفعت نہ ہو۔

”کلمۃ خبیثہ“ سے کیا مراد ہے؟ اس کے تخلیق سلست سے چند اقوال مذکور ہیں۔ نضاک فرماتے ہیں کہ کلمۃ خبیثہ کا ذکر کہا گیا ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس درخت کی طرح، جس کی صفات اور اہمیت کا اوپر ذکر ہوا، کافر کے اعمال خیر کی رُوح سے خالی ہوتے ہیں، ان میں کوئی ثبات اور وزن نہیں ہوتا اور نہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی برکت اور منفعت عطا فرماتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک کلمۃ خبیثہ سے مراد شرک ہے، اور تجرۃ خبیثہ سے مراد کافر ہے۔ یعنی مشتبہ شرک اور مشتبہ بہ کافر کی ذات ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ شرک کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی جس پر مشرک اعتماد کر سکے اور اپنی صداقت پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ کوئی مشرک نہ عمل قبول نہیں کرتا اور نہ اسے اللہ کے حضور میں رسائی ہوتی ہے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ ”تو اس خیرِ خبیث میں کوئی مضبوط جڑ ہے جو زمین میں جمی ہو، نہ ہی اوپر کی طرف شاخیں ہیں“ یعنی مشرک کے جیب و دامن میں کوئی نیکی نہیں ہوتی جسے دنیا و آخرت میں کوئی وزن حاصل ہو۔

ایک صاحبِ علم سے پوچھا گیا کہ کلمۃ خبیثہ کی حقیقت کیلئے؟ فرمایا تو اس کے لئے زمین میں کوئی جائے قرار ہے نہ آسمان میں کوئی محلِ صعود، بلکہ وہ اپنے قائل اور متبع کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور اس وقت تک لٹکا رہتا کہ جب تک قیامت نہ آجائے۔ ان دونوں مثالوں کے بیان کرنے اور کلمۃ طیبہ اور کلمۃ خبیثہ کی حقیقتیں عریاں کر دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان دونوں کے آثار و نتائج پر روشنی ڈالتا ہے، اور اپنی صفتِ عدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ یٰبٰی بات (یعنی کلمۃ طیبہ) کے ذریعہ دنیا کی زندگی (میں بھی) اور آخرت میں بھی ثبات (جہاد) بخشتا ہے۔ اور اللہ ظالموں کو آوارہ و بے راہ بنا دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الْعَقَابِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ؕ وَكَیْضَلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ؕ وَیَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ (ابراہیم ۴۰)

اس آیت میں انسانی فلاح کا حقیقی راز کھول دیا گیا ہے۔ خدا کی اس نوازش پر، جسے اس نے ثبات اور جہاد اور قرار بخشنے سے تعبیر کیا ہے، انسان کی کامرانی یا محرومی کا دار و مدار ہے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی اس نوازش سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا گمی کو اپنی اس ثبات بخشی کی نعمت سے محروم کر دے تو دیکھتے دیکھتے اس کے ایمان کی اور اس کی زندگی کی بنیادیں ہل جائیں۔ عام انسان تو ایک طرف رہے خود تمام انسانوں کے سردار اور دنیا کے سب سے بڑے صاحبِ ایمان بندہ (روحی فدا) کے بارے میں خدا کہتا ہے کہ:

لَوْ لَا اَنْ تَبْتَغَا لَكَ لَقَدْ كُنْتَ تَرَكُنْ اِلٰهِيْهُوَ شَيْئًا قَلِيْلًا ؕ (بنی اسرائیل ۳۶)

دوسری جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اور اے پیغمبر! گذشتہ انبیاء کے جتنے قتلے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ ہم تمہارے دل کو ثبات اور مضبوطی بخشتے ہیں۔

وَكَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الرُّسُلِ مَا نَكُنَّتُمْ بِهٖ فَوَآدِكُمْ (نور ۱۰)

جن کو صرف راسخون فی العلم ہی سمجھ سکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی نگاہوں میں اس کا عملی پہلو غالب تھا، یہاں اس بات کی تصریح کی ضرورت ہے کہ ظاہری اور عملی حیثیت کے علاوہ قرآن کریم کی نظری اور عقلی حیثیت بھی اہم ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب جو آسانی کے ساتھ صرف چند اجزاء میں نمایاں اور صاف لکھی جاسکتی ہے، قیامت تک کے لئے اُمّتِ سلیمہ کا دستور العمل بنائی گئی ہے اور ہر زبان اور ہر مکان میں ان کی ہدایت کا نصاب قرار دی گئی ہے۔ اگر یہ ایسے حقائق جادوانی پر مشتمل نہ ہوتی جن کو ابد الابد تک انسانی نفسیں ختم نہیں کر سکیں گی، تو کیونکر ان کا دائمی نصاب ہدایت بننے کی صلاحیت رکھتی؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن سے صرف عملی نصیحت ہی لینے کی ہدایت نہیں کی گئی بلکہ اس میں تفکر اور تدبیر کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً:۔۔۔

كِتَابٌ اُنْزِلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّیَدِّ بَرٍّ وَّاٰیَاتٍہٗ (۲۹) مُبَارَكٌ كِتَابٌ ہِم نے تیری طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں۔۔۔ دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔۔۔

اَفَلَا یَتَذَكَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْرٌ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَا لَهَاہِمْ (۳۰) کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں میں ان کے فضل پڑے ہوئے ہیں۔۔۔ اور آیت ہے:۔۔۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْہِہُمْ وَلَعَلَّہُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ... (۱۶) اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا تاکہ لوگوں کے لئے جو اتارا گیا ہے اس کو ان کے سامنے بیان کر دے اور تاکہ لوگ اس میں تفکر کریں۔

والغرض۔۔۔ اصل نظر کو قرآن نے اپنی آیات میں فکر و نظر کی دعوت دی ہے تاکہ وہ ان سے ہدایت لیتے اور اپنی فلاح کا راستہ نکالنے رہیں۔ اس کا دعویٰ ہے:۔۔۔ اِنَّ هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ ؕ (۱۸) وہ نہیں ہے مگر سارے عالموں کی نصیحت کے لئے۔ یعنی مجلہ بنی نوع انسان کے لئے خواہ وہ کسی عالم، کسی ماحول، کسی زمان اور کسی مکان میں ہوں۔ یہی وجہ تھی کہ عہد رسالت میں فقہاء صحابہؓ اس کی آیات میں تدبر کرتے تھے اور بعض امور کو جو ان کے سامنے فی الجملہ واضح نہیں ہوتے تھے، خود رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتے تھے لیکن بہت کم، کیونکہ کثرت سوال کی آفتوں سے وہ ابھی طرح واقف تھے۔۔۔

اکثر صحابہ کرامؓ بہ نظر احتیاط انہیں معافی پر اکتفا کرتے تھے، جو بعض الفاظ یا آیات قرآن کی تشریح کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سموع ہوئے تھے خود قرآن کی تفسیر میں کچھ کہنے سے پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ ابن سیرین نے کہا ہے کہ میں نے عبیدہ سے ایک آیت کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ اللہ سے ڈرو اور سیدھے چلے چلو، لیکن بعض صحابہؓ مثلاً ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ رضی اللہ عنہم قرآن میں تدبر اور تفکر کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک جو چیز ناجائز تھی وہ یہ تھی کہ بلا حقیقت کو پہنچے اور اچھی طرح سمجھے ہوئے آیات کی تفسیر کی جائے۔ یا بعض اہل مذاہب مثلاً فارسی شیعو، قدری، مرجی وغیرہ جو اُس وقت پیدا ہو چکے تھے ان کے عقائد کے مطابق تاویل کی جائے۔ اُس زمانہ میں تفسیر کے لئے عربی زبان، جاہلیت کے رسوم و عادات جن کو قرآن نے مٹایا ہے۔ عہد رسالت کے واقعات جن کا تعلق قرآن سے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال اور قضایا وغیرہ کا جاننا ضروری تھا انہیں کی مدد سے آیات کی تشریح کرتے تھے۔۔۔

اسرائیلیات | قرآن میں دینی تعلیم کے لئے علاوہ ایسے تاریخی حقائق بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا علم اصلاح نفوس بشری کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً عالم کی تکوین آدم کی پیدائش اور انبیاء سابقین اور اقوام گذشتہ کے واقعات، انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب کسی شے کا ذکر سنتی ہے تو اس کے متعلق مزید معرفت کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے عہد صحابہؓ میں لوگ ان امور کو ان علماء اہل کتاب سے جو اسلام لائے تھے دریافت کرتے تھے، خود حضرت ابن عباسؓ جبرائیلؑ بھی ابن جبرؓ رطبری کے بیان کے مطابق کعب جبار کے پاس بیٹھتے اور اپنی

دیکھو حق پر مضبوطی سے جئے رہنے کے لئے پیغمبر کو بھی تائید الہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ پھر یہی وہ توفیق الہی تھی جس نے صحابہ کرام کی ایک منہی بھر جماعت کو اپنے سے تنگے دشمنوں کے مقابل میں فتح مند کیا۔ اور فتح کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات بگاتے وقت مسلمانوں کو یاد دلایا کہ: —

یا دُرُؤسَ وَ اُنْ وَ قَتْ کُوجِبْ تہار ابروردگار (مدد کے لئے نازل ہونے والے ملائکہ) بروچی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پس مومنوں کو ثابت قدم رکھو —

اِذْ یُوحِیْ سَآئِکَ اِلَی الْمَلَآئِکَۃِ اِذْ مَعَکُمْ فَشَبَّوْا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (الافال - ۲)

نہ صرف دنیا کی زندگی میں بلکہ آخرت میں بھی یہ توفیق مومنوں کے شامل حال ہے گی، جیسا کہ آیت زیر بحث میں تصریح ہے اور ایک مشہور حدیث میں بھی آتا ہے کہ ”وَهُوَ یَسْأَلُهُمْ وَ یُخَبِّرُهُمْ“ یعنی اللہ تعالیٰ — — — — — ان مومنوں سے سوالات کرے گا اور ساتھ ہی دل میں قوت اور ثبات بھی بخشتا جائے گا اور درحقیقت مرنے کے بعد ہی کا وقت ایسا ہوگا جب کہ انسان کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول ہی عذابِ قبر کا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں بروایت براہِ ابنِ عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ: —

”جب مومن برزخی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے تو ایک آنے والا اس کے پاس آتا ہے، اور اس سے پوچھتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ — تیرا دین کیا ہے؟ — تیرا پیغمبر کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے؟ — اور میرے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہ سن کر وہ اسے زور سے جھنجھوٹا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ بتا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور یہ آخری آزمائش ہے جس سے مومن دوچار ہوتا ہے۔ اور یہی وہ وقت ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یُخَبِّرُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ — الخ چنانچہ بندہ پھر جواب دیتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے اور میرے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں (فرشتہ یہ سن کر کہتا ہے کہ صمد قوت (تو نے سچ کہا) —

صحاب کے اندر تھوڑی سی کمی بیشی کے ساتھ یہ حدیث متعدد طریق سے مروی ہے کہ بعض میں ہے کہ آنے والا فرشتہ ایک نہیں بلکہ دو ہوں گے اور مردہ کو زندہ کر کے یہ سوالات کریں گے۔ اسی طرح دوسری روایتوں میں اسی قبیل کی بعض اور تفصیلات بھی ہیں — ”القول الثابت“ سے مراد قول حق اور کلمہ صدق ہے، یعنی قول باطل اور کلمہ صدق ہے، یعنی قول باطل اور کلمہ کذب کا منہ کیونکہ قول کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک قول وہ ہوتا ہے جس کے اندر کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ دوسرا وہ جو حقیقت سے عاری ہوتا ہے حقیقت رکھنے والے قول کو قول ثابت کہا گیا ہے، اور قول اثبت (یعنی ثابت ترین قول) کلمہ توحید ہے کیونکہ یہی وہ سراسر حقیقت قول ہے جس کے ذریعہ اللہ کے بندوں کو دنیا و آخرت کی ہر زندگی میں ثبات اور قوت بخشتا ہے۔ اس قول کے اندر اتنی قوت ہوتی ہے کہ انسان جب اس کی کتب تک پہنچ جاتا ہے تو ساری مادی قوتیں اس کے سامنے بیچ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ نہ بچے آدمی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جبری شجاع اور قوی القلب ہوتا ہے نہ جھجھوٹے سے بڑھ کر کوئی ذلیل بزدل اور بے حمیت —

خدا کے حضور دُنیوی تعلقات کی بے اثری کی مثالیں :-

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ
نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدِكُنِ مِنْ
عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَتَا نَفْسَهُمَا فَلَوْ
لَغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ
ادْخُلَا الْمَنَارَ مَعَ الدَّاحِلِينَ ۝

تحریم (۱۲)

کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ زوجہ نوح اور زوجہ لوط کی مثال دیتا ہے کہ یہ دونوں عورتیں ہمارے بندوں میں سے دُعا صالح بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انہوں نے (ان کی بیروی کرنے کے بجائے) ان سے غداہی کی (اور ان کے خلاف خدا کے نافرمانوں اور گمراہوں سے ملی رہیں) اس لئے ان کے شوہر (اپنی پیغمبرانہ برگزیدگی کے باوجود) اللہ کے مقابلہ میں ان کے کچھ کام نہ کئے اور ان سے کہا گیا کہ اور دونوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جا داخل ہو۔

اور اللہ تعالیٰ مومنوں کے لئے زوجہ فرعون کی مثال بیان کرتا ہے جب کہ اس نے کہا۔ اے میرے پروردگار! میرے لئے اپنے ہاں بہشت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے (بڑے، اعمال کی لعنتوں) سے نجات دے اور مجھے بچا ان ظالموں سے۔ نیز (دوسری مثال اللہ تعالیٰ) "عمران" کی بیٹی مریم کی دیتا ہے جو پاک بازا اور عظیمہ تھی۔ پھر تم نے تمہارے روح اس میں پھونکی اور اس نے ہمارے کلمات اور ہماری کتابوں کی تصدیق کی۔ نیز وہ ہمارا فرمانبردار باادب بندوں میں تھی۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ
فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي
عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَبِخَنِي مِنْ
فِرْعَوْنَ وَعَمِلَمْ وَبِخَنِي مِنَ الْقَوْمِ
الظَّالِمِينَ ۝ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ
الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ
رُوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَ
كُنْتِ مِنَ الْقَائِمِينَ (تحریم-۱۲)

ان آیات میں تین مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کافروں کے لئے اور دو مسلمانوں کے لئے۔ پہلی مثال میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی پاداش آدمی کو بہر حال ملے گی۔ خواہ اس کا رشتہ کیسے ہی برگزیدہ و مقدس لوگوں سے ہو۔ بزرگوں کے ساتھ اس کے جوہی و صہری وغیرہ دُنیوی رشتے بھی ہوں، ان میں سے کوئی اسے نہ بچا سکے گا کیونکہ یہ تمام رشتے قیامت کے دن ٹپکے ہوں گے، اگر کوئی رشتہ اس دن کام آسکتا ہے تو وہ رشتہ ہے جسے خدا کے فرستادوں نے خدا اور بندوں کے درمیان قائم کیا ہے وگرنہ اگر رجمی نسب اور ازلی تعلقات منکرین خدا کے حق میں کچھ بھی منفعت بخش ہو سکتے تو نوح اور لوط علیہما السلام کے رشتہ ہائے ازدواجی ان کی بیویوں کے حق میں ضرور مفید ثابت ہوتے جو اگرچہ ذمہ کفار میں تھیں لیکن ان کے شوہر وقت کے سب سے بڑے ہاندا انسان تھے، مگر ہوا یہ کہ اتنے قریبی رشتے بھی ان کافر عورتوں کے کچھ کام نہ آئے وہ بھی تمام کفر کیشتوں کی معیت میں بالکل انہیں کی طرح مستحق جہنم قرار دے دی گئیں۔

یہ آیت ان تمام لوگوں کی جھوٹی اُمیدوں کی جڑ کاٹ دیتی ہے جو خود تو دُعا معصیت الہی میں ڈوبے رہتے ہیں لیکن توقع رکھتے ہیں کہ فلاں مرد صالح کا دامن انصال ہمیں اپنے اندر چھپالے گا اور ہم اُخروی سزاؤں سے بچ جائیں گے۔ فرض کر لو کہ ایسی بے بنیاد توقعات رکھنے والے کا حق اس شخص سے بہت ہی قوی ہے جس کے طفیل یہ زندہ رہا ہوا اپنے کو جنت کا وارث سمجھ بیٹھا ہے، لیکن کیا کوئی تعلق زوجیت، اور ابوت و اہلیت کے تعلقات سے بھی زیادہ گہرا زبردست ہو سکتا ہے؟ پھر اگر حضرت نوح اپنے چیتے بیٹے کو، حضرت ابراہیم اپنے باپ کو اور حضرت نوح

و لوط علیہ السلام اپنی بیویوں کو خدا کی پکڑ سے نہ بچا سکے گا۔ تو تا بدیگمال چہ رسد۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں قانون مجازات کے اس اہل الاصول کو کئی جگہ بیان فرمایا ہے۔ سورہ ممتحنہ میں ہے: —

”تمہاری رشتہ داریاں اور تمہاری اولادیں قیامت کے روز کچھ کام نہ آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے درمیان (باہل ٹھیک ٹھیک) فیصلہ ہوگا۔ دوسری جگہ ہے: —

”قیامت کا دن وہ دن ہے جب کوئی کئی کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکے گا اور سارا معاملہ اُس دن اللہ ہی کے اختیار میں ہوگا۔“ (سورہ انفطار) ایک مقام پر اور آتا ہے کہ: —

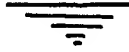
”لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو اور خوف کھاؤ اس دن کا جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا۔ اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے۔“ یہ تمام آیات مشرکین کی ان ساری باطل تنادوں کو جھٹلا رہی ہیں جو محض کسی کے ”طین“ نجات کی اس لگائے بیٹھیں اور سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کی شفاعت خدا کے روبرو ہمیں ہر سزا سے محفوظ کر دے گی، یہ سب بے بڑی گمراہی ہے جو کوئی انسان افتیاء کر سکتا ہے۔ اور اس کی بیخ کنی کیلئے سارے انبیاء اور صحفِ سماوی کا نزول ہوتا ہے۔ یہ مثال تو کفار کی عبرت پذیری کے لئے تھی۔ اس کے بعد رئے خطاب سلمانوں کی طرف پھرتا ہے اور دو مثالیں ان کے سامنے بیان کی جاتیں ہیں۔ پہلی مثال میں انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں جس طرح کسی بنی یا ولی کا رشتہ کسی بدکار شخص کو کفر کے دار تک پہنچنے سے بچا نہیں سکتا، اسی طرح کسی نیکو کا شخص کو کسی مسکرتی کی قربت داری بھی ہرگز ہرگز موجب نفع نہیں ہو سکتی جس کے وہ اس کی مصیبت پرستی اور اس کے کفر و انکار سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو۔ فرعون سے بڑا دشمن حق شاید ہی پیدا ہوا ہو، لیکن ایسے بڑے کافر کی بیوی بھی جب اللہ کی فرماں بردار بن گئی تو اس کافر فرعون کی زوجیت میں ہونا اس کی نجات کی راہ میں باہل مائل نہ ہوا، یہاں ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے، پیغمبر کی بیوی اگر بد عمل ہے تو پیغمبر کے رشتہ ازدواج میں ہونا اس کے لئے کچھ مفید نہیں۔ اور فرعون کی بیوی اگر نیکو کار ہے تو اتنے بڑے کافر و ظالم کے ساتھ رشتہ ازدواج میں وابستہ ہونا بھی اس کیلئے کچھ نقصان دہ نہیں۔ مومنوں کے ساتھ کفار کے رشتے مومنوں کی حیاتِ اخروی کے لئے تو کسی گزند کے باعث نہیں ہو سکتے، البتہ یہ ممکن ہے کہ دنیا کی زندگی میں انہیں کوئی نقصان پہنچ جائے اور جب اہل کفر پر خدا کا عذاب نازل ہو تو اس کی لپیٹ میں یہ صاحبِ ایمان بندے بھی آجائیں۔ اس لئے کہ خدا کی سنت ہی یہ ہے کہ جب بحیثیت مجموعی اس کی اطاعت سے بغاوت ہونے لگتی ہے اور عتاب الہی نمودار ہو جاتا ہے تو اس وقت عذاب کی وسعت محض کفار اور معاذین حق ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ان کے ساتھ رہنے والے دو چار صالح بندے ہوتے ہیں وہ بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ — یہ زلزلے میں نیک دہ دونوں کے گھر پر باد ہوتا ہے۔

دوسری مثال میں اسی حقیقت کو ایک تیسرے پہلو سے نمایاں کیا گیا ہے۔ پہلی مثال میں جس عورت کے انجام کو پیش کیا گیا تھا وہ الہی عورت تھی جس کا تعلق ایک مرد صالح سے تھا۔ دوسری مثال میں جس عورت کا ذکر کیا گیا ہے اس کا رشتہ ایک کافر و فاسق شخص سے تھا۔ — اب تیسری عورت (حضرت مریم) کی مثال دی جاتی ہے جو مذکورہ بالا دونوں رشتوں میں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی تھیں۔ ان تینوں اقسام کی عورتوں کے حالات و عواقب بیان کرنے میں دراصل ایک ہی مقصد پوشیدہ اور ایک ہی اصول اجراء کا اظہار مطلوب ہے، یعنی یہ کہ ہر شخص اپنی شخصی ذمہ داری پر نجات یا عذاب کا سزاوار بنتا ہے نہ کسی نیک آدمی کا رشتہ اُسے آخرت کی سزاؤں سے بچا سکتا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں مذکور ہے۔ نہ کسی بدکار کا رشتہ مادی کسی کی نجاتِ اخروی میں مائل ہو سکتا ہے جیسا کہ دوسری مثال بتا رہی ہے۔ اور نہ کسی شخص کی جزا و سزا پر اس کا کوئی رشتہ رکھنا اثر انداز ہو سکتا ہے جیسا کہ تیسری مثال (حضرت مریم کی سرگزشت) شہادت دے رہی ہے۔ —

سورہ کے سیاق پر نظر ڈالنے سے ان امثال کے بعض نکات اور سامنے آتے ہیں۔ پہلے سے ازدواجِ مطہرات کا ذکر چلا آ رہا ہے اور انہیں اپنی شخصی ذمہ داریاں یاد دلانی جاری ہیں۔ پھر اس سلسلے میں انہیں کے مثل دوسری عورتوں کے حالات پیش کر کے انہیں متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر قرآن

اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی تو یاد رکھو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تمہارا انتساب آخرت میں کچھ کام نہ آئے گا۔ جیسا کہ لوطؑ اور نوح علیہما السلام کی ازواج کا معاملہ تمہارے سامنے ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے ان مثال میں عام قرابت داریوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ خاص نکاحی رشتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یحییٰ بن سلام کہتے ہیں کہ پہلی مثال حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ کی تنبیہ اور تحذیر کے لئے بیان کی گئی ہے۔ پھر دوسری مثال کے ذریعہ انہیں معصیت و طاعت پر ابھارا گیا ہے۔ تیسری مثال میں بھی جو حضرت مریمؑ سے متعلق ہے اور مومنوں کے لئے بیان کی گئی ہے ایک نکتہ مضمر ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت مریمؑ پر یہودی اشرار نے جو جھوٹی تہمتیں تراشی تھیں۔ انہوں نے اللہ کے نزدیک حضرت مریمؑ کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا بلکہ وہ اس کے ہاں ویسی ہی برگزیدہ رہیں جیسا کہ واقعہ وہ تھیں اور انہیں اللہ تعالیٰ نے تمام صنف نازک پر فضیلت بخش کر صدیقہ کا مرتبہ جلیلہ عطا فرمایا۔ پس اس مثال سے معلوم ہوا کہ فاسق و فاجر لوگوں کا کسی نیکو کا گوتہم کرنا خدا کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا۔

(امثال القرآن از امام ابن قیم)



قرآن میں قسموں کی تشریح

علامہ فراہی امعان القرآن میں لکھتے ہیں: —

بعض اوقات آدمی اپنے مخاطب کو مطمئن کرنے کے لئے ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کسی بیان یا وعدے کو زور اور تاکید کے ساتھ پیش کرے، خصوصیت کے ساتھ اہم قومی و اجتماعی معاملات میں ایسا کرنا بسا اوقات ناگزیر ہوتا ہے، ایک قوم، دوسری قوم کے ساتھ یا ایک بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ، یا عام افراد آپس میں کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو باہمی اعتماد و اطمینان کے لئے اس طرح کی تاکید و توثیق ضروری سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ چیز موافق کو مخالف اور دوست کو دشمن سے پہچاننے کا معیار قرار پا جاتی ہے۔ انسان کی اس تمدنی ضرورت نے طرح طرح کے طریقے اور خاص خاص الفاظ پیدا کر دیئے جس سے لوگ اس تاکید کا اظہار کرنے لگے۔ یہ قسم کی اصل ہے۔

رومیوں، عربوں اور عبرانیوں کے حالات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات اس تاکید کا اظہار دلہنا ہاتھ پکڑ کر کرتے تھے۔ جب معاہدے کے وقت ایک فریق دوسرے فریق کا ہاتھ پکڑ لیتا تھا تو یہ فریقین کی طرف سے معاہدے کی نچستگی اور مضبوطی کے ساتھ اس کی پابندی کا اظہار و اقرار ہوتا، گویا یہ ہیئت ان کی طرف سے اس امر کا اعلان سمجھی جاتی کہ ہمارا تعلق محکم ہے اور اس کی ضمانت کے طور پر داہنے ہاتھ گواہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قسم کے لئے یمین کا لفظ استعمال ہوا جس کے معنی عربی زبان میں داہنے ہاتھ کے ہیں۔

یہیں سے قسم میں کفالت و ضمانت کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ اس چیز کو ہر صاحب نظر جانتا ہے۔ بیعت کے وقت داہنا ہاتھ متھامنا یا بیع و شرا کے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارنا اسی حقیقت کی ایک عملی تصویر ہے۔

جب عہد میں شریک ہونے والے بہت سے لوگ ہوتے تو ایسا بھی ہوتا کہ پانی سے بھرے ہوئے کسی برتن میں سب اپنے داہنے ہاتھ ڈالتے اور چونکہ برتن کی چیز سے سب کے ہاتھ مٹس ہوتے اس لئے اس کے معنی یہ سمجھے جاتے کہ گویا سب نے ایک دوسرے کا داہنا ہاتھ پکڑ کر کسی بات پر اتفاق کیا ہے اور چونکہ چھوٹے اور لگنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں چیز پانی ہے۔

بعض مرتبہ کوئی چوپایہ ذبح کر کے اس کا خون معاہدے کے دونوں فریق اپنے جسموں پر چھڑکتے۔ اس کا مطلب یا تو یہ سمجھا جاتا کہ یہ دوستی رشتہ خون و قرابت کے درجے کی ہے یا یہ کہ اس عہد کی حفاظت کی راہ میں ہم اپنا خون تک بہا دیں گے۔ ایک صورت یہ تھی کہ کسی چیز سے بغیر شرط کے رک جاتے، اس کو الیتہ کہتے ہیں، قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے: —

لَّذِينَ يُؤْتُونَ مِنْ شَيْءٍ مِّمَّا تَرَكَوا
أَمْ بَعْدَ أَشْهَرٍ (البقرہ ۲۲۶) —

جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ ملنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں
ان کے لئے چار مہینوں کی مہلت ہے۔

پھر آہستہ آہستہ اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہوئی یہاں تک کہ الیت اقامت کے مترادف کی حیثیت سے استعمال ہونے لگا۔ اس کی مثالیں بہت مل سکتی ہیں۔ الیت، کو اقامت کی جگہ بہت استعمال کیا گیا ہے۔ بعض جگہ اسی تاکید کے مقصد کے لئے

لام تاکید استعمال کرتے تھے۔ اس کی مثال قرآن مجید میں بھی ہے

وَأَن لَّوِیْنَتْهُوَ أَعْمَاقُ یُقُولُونَ لِمَسَّنَ الَّذِیْنَ
كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابُ الْإِیمِ (المائدہ - ۴۳)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَیَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ یَّصُورُ (الحج - ۴۰)

اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کی اصل حقیقت محض تاکید ہے اس لیے ہر جگہ مقسم بہ معذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں لام قسم آیا ہے سب کو اسی اصول پر قیاس کرنا چاہیے اور اگر اس سے پہلے کوئی ایسا لفظ آئے جو قطعیت اور یقین کو ظاہر کرے تو وہ بھی لفظ قسم سے مشابہ ہوگا۔ قرآن مجید میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً: —

شَوْ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا سَأَلَ فَأَمَّا الْإِیلِیَّت
لَیْسَنَ جَنَّتُهُ حَتَّىٰ حِیْنٍ - (یوسف ۲۵)

دوسری جگہ ہے: —

قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقُّ أَقُولُ لَا مَلَکَ بَنَ
جَهَنَّمَ (ص - ۸۵)

پس اس طرح کے مواقع میں ہر جگہ مقسم بہ معذوف ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ ان مثالوں میں معذوف ماننا کلام کی بلاغت کے بالکل خلاف ہے —

قسم کے لئے مقسم بہ ضروری نہیں ، مشہور الفاظ قسم کی تشریح

— اللہ اور اس کے شعائر کی قسم مفرد اور بسیط معانی اور مفہام میں سے نہیں ہے کہ اس کے لیے شروع ہی سے متعلیٰ الفاظ وضع ہو کر استعمال میں آتے۔ یہ چیز تو معاشرتی ضروریات اور دینی عقائد کے تعلق و امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔ پس یہ بات کچھ صحیح نہیں ہے کہ جہاں کہیں مقسم بہ مذکور نہ ہو وہاں ہم یہ خیال کر لیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی قسم کھائی گئی ہے اور لفظ اللہ یہاں مقدر ہے —
ہم یہاں ان الفاظ کے معانی کی تشریح کرنا چاہتے ہیں جو قسم کے لیے عام طور پر مستعمل ہیں اور مقصد یہ دکھانا ہے کہ یہ الفاظ اصلاً اللہ تعالیٰ یا اس کے شعائر یا کسی خاص چیز کی قسم کے لیے نہیں وضع ہوئے تھے، وہ الفاظ یہ ہیں: —

۱ — یمین، نذر، الیتہ، قسم، حلف —

”یمین“ کی اصل حقیقت اور قسم کے لیے اس کا عام استعمال اوپر ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں —

”نذر“ کے اصل معنی کسی شے کو دور کرنے اور اس سے بچنے کے ہیں۔ اگر کسی شے کو تم اپنے سے ہٹا کر خدا کے لیے خاص کر دو تو یہ ”نذر“ ہے۔ یہیں سے اس میں کسی شے کو حرام کر دینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ عبرانی میں اس کا یہی مفہوم ہے۔ پھر یہ لفظ اپنے اوپر کسی لذت کو حرام کر دینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اپنے اوپر کسی شے کو بطور قسم لازم کرنے کے مفہوم

کے لیے اس میں وسعت پیدا ہو گئی۔

”البتہ“ کے معنی ہیں کسی امر سے کوتاہی کرنا۔ ”آبل“ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے میں کوتاہ اور عاجز ہو۔ پھر یہ کسی شے کو چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یہیں سے یہ عورتوں سے قسم کھا کر ترک تعلق کے معنی میں منسلک ہو گیا۔ پھر اس میں مزید وسعت پیدا ہوئی اور اپنے اوپر کسی شے کے لازم کر لینے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ خواہ یہ لازم کر لینا بصورت اختیار لیکن اس میں غالب پہلو کسی ایسی شے کے لازم کرنے کا ہے جس میں کچھ مضرت کا شائبہ ہو۔ اس اعتبار سے یہ ”نذر“ سے مشابہ ہے۔

”قسم“ قسم کے اصل معنی (قطع) کاٹنے کے ہیں قسمت الشیء دو قسمتہ اسی معنی میں مستعمل ہیں اور قطع کا لفظ شک و شبہ کی نفی کے لیے عام ہے۔

قرآن مجید میں ہے:-

أَهْلُوا لَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنْتَهِوْا
اللَّهُ بِرَحْمَةٍ (الاعراف - ۴۹) | کیا یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں تم نے قسمیں کھائی تھیں
کہ خدا کی رحمت میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے

دوسری جگہ ہے:-

وَقَالَتْ هُمْ مَا إِنِّي لَأَكْسِبُ النَّصِيحِينَ
فَذَلُّهُمْ أَفْزُرُ (الاعراف - ۲۱) | اور اس (ابلیس) نے ان دونوں سے قسمیں کھائیں کہ میں تم
لوگوں کے خیر خواہ ہوں میں ہوں۔ پھر ان کو فریب مائل کر لیا۔

حلف کے معنی بھی کاٹنے اور تیز ہونے کے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بالکل لفظ قسم کے مشابہ ہے۔ عربی میں دستان حلیف اور لسان حلیف وغیرہ محاورات عام طور پر مستعمل ہیں۔ ازہری کے نزدیک یہ ’حلف‘ سے ماخوذ ہے جو ایک تیز نکیلی گھاس سے پس حلف علی امر کا مفہوم یعنی وہی ہوگا جو قطع باہر ہوگا۔ لفظ کی اصل معنوی روح یہی ہے۔ پھر یہ لفظ قسم کی طرح بات میں عزیمت اور پختگی کے اظہار کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اور اسی وجہ سے اس کے لئے مقسم بہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔

قسم کا اصلی مفہوم جب کہ مقسم بہ موجود ہو

جو قسم مقسم بہ سے خالی ہو اس کی اصل حقیقت جب تم پر واضح ہو گئی تو مقسم بہ والی قسموں کا سمجھ لینا تمہارے لیے کچھ مشکل نہیں رہا۔ ان کی حقیقت بس یہ ہے کہ قسم کھانے والا اپنے ساتھ اپنے دعوے کے گواہ کے طور پر مقسم بہ کو ملا لیا کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے بے قسموں میں بیشتر ’د، ب، ت‘ وغیرہ کا استعمال ہے جو معصیت و معیبت کا مفہوم ظاہر کرنے والے حروف ہیں۔ ’د‘ اور ’ب‘ معیت و معیبت کے مفہوم کے لیے مشہور و مستعمل ہیں، البتہ ’ت‘ کے بارے میں ہمیں تردید ہوگا۔ لیکن یہ بھی حقیقت میں ’و‘ ہے جو منقلب ہو کر ’ت‘ بن گئی۔ جس کی مثال تم ’تقویٰ‘ اور ’تجاہ‘ وغیرہ الفاظ میں دیکھ سکتے ہو۔

قرآن مجید سے بھی اہل اس دعوے کی تائید ہوتی ہے۔ انبیاء کے میثاق کے متعلق فرمایا ہے:-

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الْمُنْبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ
مِّنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ تَتَوَجَّأُونَ كَوْنًا سَوًا
مُّصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ لَتَقُولُنَّ بَشَٰرًا
وَلَنَنْصُرَنَّ اللَّهُ قَالَ أَفَسَرَرْتُمْ وَآخَذْتُمْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب کہ اللہ نے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ البتہ میں تم کو کتاب و حکمت دوں اور پھر جب آئے تمہارے پاس کوئی رسول مطابق اس کچھ جو تمہارے پاس ہے تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا پوچھا،

عَلَىٰ ذَلِكُمْ أَصْبَرْتُ قَالَ أَفَرَأَيْتَ مَا كُنْتَ تَفْعَلُ ۚ أَوَآتَاكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُ ۚ أَمْ جَاءَ لَكَ مِنَ الشَّهِيدِينَ حَدٌّ ۚ ذَلِكُ فَؤَادُكَ ۚ فَالْغَيْبُ هُوَ الْغَيْبُ ۚ (آل عمران ۸۶-۸۷)

یعنی یہ عہد جو تم سے میں نے باندھا ہے اپنی اور تمہاری موجودگی میں باندھا ہے پس اس سے مگر ناکسی حال میں جائز نہیں ہوگا اور جو اس عہد کو توڑیں گے وہ بدعہد اور فغان ٹھہریں گے۔

اس طرح کی تاکیدات کا اصلی راز یہ ہے کہ آدمی جب کہتا ہے کہ: "اشہد بہ" میں اس کی شہادت دیتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں اس کو اپنے علم، واقفیت اور مشاہدے کی بناء پر کہتا ہوں، صرف دوسروں سے سُن کر نہیں کہتا، پس ایسی شہادت کے بعد اگر وہ جھوٹ بولے اور منکر جائے تو اس کے لئے کوئی وجہ عذر نہیں ہے۔ اسی بناء پر حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا:۔

وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلَّمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ۔ (یوسف ۸۱)

اور ہم نے نہیں شہادت دی مگر اس بات کی جو ہم نے جانی اور ہم غیب کے عالم نہیں ہیں۔

قسم میں اس پہلو کا استعمال بہترین شکل میں مندرجہ ذیل آیت میں پایا جاتا ہے:۔

لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ لَكِنِ اللَّهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ

شہادت کے اس سارے جھگڑے کو قرآن مجید کی ایک آیت چُکا دیتی ہے جس میں شہادت "اور" "اشہاد" تصریح کیا ہے

قسم کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ فرمایا ہے:۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا لَنْ نَبْرَأَكَ لِرَسُولِ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَنَّكَ لَرَسُولِ اللَّهِ وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۚ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ (الأنفال ۲۰-۲۱)

جب تمہارے منافق آتے ہیں کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے اور اللہ گواہ ہے کہ منافق جھوٹے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے۔ پس روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔

قسم مقسم بہ یا مخاطب یا مکلم کی تعظیم کے پہلو سے

۱۔ بیجان عرب کی فطرت کا اصلی جوہر تھی، بالخصوص جب وہ کوئی معاہدہ کر لیتے کسی بات کے لئے زبان دے دیتے معاملے میں قسم کھا بیٹھتے تو پھر اس سے ملنا ان کے لئے ناممکن ہوتا۔ وہ کسی کے حلیف ہوتے یا کسی سے رشتہ جو قائم کرتے نذر ملتے تو اپنی ذمہ داری جس طرح بھی ممکن ہوتا ضرور پوری کرتے، قسم کھالینے کے بعد اس سے منکر نا اور پیچھے قدم ہٹانا وہ غیرت و حمیت کی انتہائی توہین سمجھتے تھے۔ معاہدے کے وقت وہ جو بات میں ہاتھ دیتے تھے تو اس کی معنی یہ ہوتے کہ اس کی حرمت کے لئے وہ اپنی جان کے لئے ہر جو کچھ برداشت کر لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جان کو خطرے میں ڈالنا قسم کا ایک لازمی ہو گیا۔

ہے۔ چنانچہ عرب میں سب سے زیادہ عام قسم "عمری" (میری جان کی قسم ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں اپنی بات کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دوں گا) —

۲ — دوسری یہ کہ جب مقسم بہ مخاطب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مقصود مخاطب کے عزت و احترام کا اظہار ہوتا ہے مثلاً فرمایا ہے: —

لَعَنُوكَ اِنَّهُوَ لَفِي سَكْرَةٍ يَوْمَ يَعْمَهُونَ (الحجر ۲) تیری جان کی قسم وہ اپنی مدہوشی میں اندھے ہوئے جا رہے ہیں۔ اس خطاب سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بڑھائی ہے۔ اسی اسلوب کی دوسری آیت ہے۔
فَلَا دَرَبَكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ
يُحَكِّمُوكَ (النساء ۶۵) | پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ نومن نہیں ہیں تا آنکہ تجھے حکم نہ مانیں —

اور جب مقسم بہ کی اضافت متکلم کی طرف ہوتی ہے تو اس سے خود اس کی عزت و عظمت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ گویا وہ کہتا ہے کہ میری عزت و حرمت ایسی بالائز شے ہے کہ اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی —

قرآن میں مخلوق کی قسموں کا جواب

۱ — قرآن نے ایک ہی لفظ کبھی بندے کے لئے استعمال کیا ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے لئے۔ ایسی صورت میں لامحالہ لفظ کے مختلف مفاہیم میں فرق کرنا پڑتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہ ہو جائے جو اس کی عظمت و تقدیس کے منافی ہو۔ مثلاً صلوة جب بندے کی طرف سے ہو تو دعا کے معنی میں ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو تو رحمت کے مفہوم میں ہے۔ اسی طرح شکسے بندے کی طرف سے اعترافِ نعمت ہے اور خدا کی طرف سے ہماری نیکیوں کی پذیرائی ہے۔ یہی حال توبہ، سخط، مکڑ، کید، اسف اور حسرت وغیرہ الفاظ کا ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ہماری لغت کا کوئی لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم اس فرق کے لحاظ کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے ہوں۔ ہم تمام الفاظ میں یہی کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کرتے وقت ان کے صرف انہی مفاہیم کو سامنے رکھتے ہیں جو خدا کی ذات برتر کے شایان شان ہوں۔ بعینہ یہی طریقہ ہم نے قسم میں اختیار کیا۔

۲ — حمل نظیر علی النظر اور تفسیر آیات بالآیات کا اصول بھی اس کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن کبھی تو دلائل و آیات کو سیدھے سادے اسلوب پر بیان کرتا ہے اور کبھی ان کے لئے قسم کا اسلوب اختیار کر لیتا ہے اور مقصود دونوں صورتوں میں اہل نظر کے سامنے شہادت پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا ہے: —

اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْخِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلُكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ
بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ
مَّاءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَا يَتِي
اَسْمَانوں اور زمین کی پیدائش، رات اور دن کی آمد و شد،
اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے نفع رساں سامان لے کر
سمندروں میں چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے
اُتارا اور اس سے زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد
شاداب کیا اور اس میں طرح طرح کے جانور پھیلانے اور ہواؤں
کی گردش اور آسمان و زمین کے درمیان مسخر بادلوں میں

لَقَوْمٌ يَعْقِلُونَ۔ (البقرہ: ۱۶۴) — عقل مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں اور ان سب کا مقصود استشہاد و استدلال ہے۔ پھر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ بعینہ یہی چیزیں ہیں جن کو قرآن نے بطریق قسم شہادت میں پیش کیا ہے۔ قسم والی آیات پر ایک نظر ڈال کر دیکھو وہ کیا چیزیں ہیں؟ آسمان، زمین، سورج، چاند، رات، دن، فجر، وقت چاشت، ہوا، ابر، پہاڑ، سمندر، شہر، انسان، باپ، بیٹا، نژاد، جفت، طاق وغیرہ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہی چیزیں ہیں جو سادہ اسلوب میں بطور دلیل و شہادت پیش کی جاتی ہیں۔ پس ان کے دلیل ہونے کے ثبوت میں خود قرآن مجید کے نظائر موجود ہیں۔ اس لئے ان کو تعظیم کے مفہوم میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو شہادت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

۳۔ خود مقسم بہ بھی اس دعوے کی تائید کرتا ہے کیونکہ کوئی عاقل ایک لمحے کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کو ایک معبود و مقدس کی حیثیت دے دے گا۔ بالخصوص جب کہ چیزیں بھی ایسی ہوں جن میں تقدس کا کوئی خاص پہلو موجود نہ ہو، مثلاً دوڑنے والے گھوڑے، غبار اڑانے والی آندھی وغیرہ وغیرہ۔ اور اس کے برعکس قرآن نے ان تمام چیزوں کے متعلق یہ بیان کیا ہے کہ سب مطیع و محکوم اور خلق کی نفع رسانی کے لئے مسخر ہیں۔ پس مجرّد ان چیزوں کی قسم کھانا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کو محض بطور شہادت کے پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ مقسم بہ اور مقسم علیہ میں بالعموم نہایت واضح مناسبت موجود ہوتی ہے۔ قرآن نے ان قسموں کو ایسے قالب میں پیش کیا کہ صاحب نظر بادی تاہل مقسم علیہ کے ساتھ ان کے تعلق کو پالیتا ہے۔

۵۔ جس طرح کی تعلیم قرآن مجید میں عام آیات و دلائل کے بیان کے سلسلے میں ہے۔ بعینہ اسی قسم کی تسیم و وسعت بعض جگہ مقسم بہ میں موجود ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

سَوْنِهِمْ، مِثْلَ قِسْمٍ كَهَاتَا هُوَ اس چیز کی جس کو تم دیکھتے ہو اور اس چیز کی جس کو تم نہیں دیکھتے۔

فَلَا أَقْسَمُ بِمَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ (الحاقہ ۳۸-۳۹)

اس قسم میں جملہ کھلی چھپی چیزوں کو سمیٹ لیا ہے اور یہ وہی تسیم ہے جو:

وَأَنْ يَمُنَ شَيْءٌ إِلَّا يُسَبِّحَ بِحَمْدِ اللَّهِ (الزمر: ۲۴)۔ نہیں ہے کوئی شے مگر اس کی تسبیح کرتی ہے حمد کے ساتھ۔

میں ہے اور اسی تسیم سے ملتی جلتی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں قسم کھائی ہے وہاں متقابل چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی روزاد، شب، زمین اور آسمان۔ پس کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی اس عموم کے ساتھ تعظیم فرمائی ہو۔ البتہ ان کو دلیل و شہادت کے طور پر ذکر کرنے کی وجہ سمجھیں آتی ہے۔ پس اس راہ کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرنا ہمارے نزدیک بالکل غلط ہے۔

۶۔ بعض جگہ مقسم بہ کے بعد ایسی تنبیہات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اہل نظر کے سامنے بطور دلیل و شہادت پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً:

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرَةٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَالْأَيْلِ إِذَا

يَسْأَلُونَكَ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حَجُّبٍ۔ (الفجر: ۱-۵) جب ڈھل چلے کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لئے۔

اس میں آخری ٹکڑا ھَاكُ فِي ذَلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حَجُّبٍ۔ (کیوں اس میں تو ہے قسم عقلمند کے لئے) بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسی کہ بالعموم دلائل کے ذکر کے بعد قرآن میں آتی ہے، مثلاً سورہ نحل میں بہت سے دلائل کے بعد فرمایا:

روایتوں کو افاد کرتے تھے۔ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کر دیا تھا کہ "اہل کتاب کے اقوال کی تصدیق کرو نہ تکذیب" مگر چونکہ ان امور کا تعلق اعمال شریعت کے ساتھ نہ تھا اس وجہ سے ان کے لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا۔ اس طرح پر اہل کتاب کی دہشیں بھی تفسیر قرآن میں شامل ہو گئیں۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ: —

"بالعموم عرب نہ پہلے سے اہل کتاب تھے، نہ علم رکھتے تھے۔ ان کے اوپر بدویت غالب تھی۔ جب ان کو موجودات کے اسباب ابتدائے تخلیق اور اہم سابقہ کے حالات وغیرہ کے جاننے کا شوق ہوتا، تو ان اہل کتاب سے جو مسلمان ہو گئے تھے دریافت کرتے، یہ بھی زیادہ تر ان ہی کی طرح بدوی تھے اور ان امور اسی قدر جانتے تھے جس قدر عوام اہل کتاب، انہیں کے بیانات لوگوں سے منقول ہو کر آیات کی تفسیر میں اہل علم ہو گئے اور بوجہ اس کے کہ ان کا تعلق احکام شریعہ سے نہ تھا تدوین کے وقت مفسروں نے مسامحت سے کام لے کر ان کی تنقید کی طرف توجہ نہیں کی اور انہیں کو کتب تفاسیر میں درج کر دیا۔" (مقدمہ ابن خلدون) —

عہد رسالت میں اہل کتاب میں سے جو حضرات اسلام لائے تھے ان میں سے سب پہلے یہودی عالم جن کو قرآن کریم نے "أَوَّلُ مَنْ كُنِيَ لَهُ هُوَ آيَةُ أَنْ يَتْلُمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ" کہہ کر اہل علم میں شمار کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ ہیں جو ہجرت نبوی کے بعد ہی مدینہ میں اسلام لائے اور ان کا انتقال سنہ ۱۱ھ میں ہوا۔ ان سے حضرت ابوہریرہؓ اور انس بن مالکؓ نے روایت کی ہے۔ دوسرے حضرت سلمان فارسیؓ ہیں۔ یہ اصلاً مجوس بلکہ ایک آتش کدہ کے متولی کے عزیز و فرزند تھے گھر سے نکل کر شام میں گئے وہاں عیسائیت اختیار کر لی۔ ایک مدت تک نصیبین اور اس کے بعد عموویہ میں رہے اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل کیا، پھر عرب کی طرف آئے وادی القریہ میں بنی کلب غزازی آگ کو غلام بنا ڈالا اور فروخت کر ڈالا، قسمت کی بادی سے مدینہ پہنچے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے، حضرت عثمانؓ کی خلافت میں مدائن میں وفات پائی۔

جس طرح حضرت بلالؓ کو حبشیوں نے اور حضرت صہیبؓ کو رومیوں نے اپنا قومی افتخار اور نمونہ بنایا ہے۔ اسی طرح اہل فارس نے اسلام لانے کے بعد حضرت سلمانؓ فارسی کو اپنا قوم کا پیش رو قرار دیا، ان کے حالات میں غیر معمولی باتیں بڑھائیں اور ان کی طرف بہت سی دہشیں منسوب کیں، بالخصوص صوفیہ عجم نے جن میں سے اکثر اپنا سلسلہ ارادت ان تک پہنچاتے ہیں —

تیسرے صحابیؓ جن سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں حضرت تیم داریؓ ہیں جو سلسلہ ۱۱ھ میں مدینہ آ کر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ نصاریٰ یمن میں سے تھے اور قصہ گوئی کرتے تھے، یعنی گزشتہ انبیاء اقوام کے حالات سناتے تھے۔ حضرت عسکرؓ کی خلافت میں ان سے قصہ گوئی کی اجازت طلب کی، مگر انہوں نے منظور نہیں فرمایا۔ آخر میں ان کے بہت اصرار کی وجہ سے صرف اس قدر اجازت دی کہ مجمع کے دن اس پہلے کہ میں جماعت کے لئے لکھوں، تم قصے سنالیا کرو، حضرت عثمانؓ کے عہد میں ان کو ہفتہ میں دو دن کی اجازت مل گئی تھی۔ جس سے اور دجال کی روایتیں انہیں سے مروی ہیں۔

اس قصہ گوئی کی دو صورتیں ہوتی تھیں، ایک قصص عامہ کی کہ قصاص مسجد میں مسلمانوں کے مجمع میں بیٹھ کر ان کو دوسری قوموں کے وہ حکایات اور حالات سناتا، جو اس نے اپنے بزرگوں سے سنے تھے، دوسری قصص خاصہ جو کسی مخصوص بڑے آدمی کے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ عہد صحابہؓ ہی میں قصہ گوئی کا رواج عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا اور چونکہ قصہ کذب آمیز بلکہ زیادہ تر بے بنیاد افسانہ ہوتے

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ - (۱۲) اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔

سورہ طہ میں ہے: —

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّوَلِيِّ التَّوْحَىٰ - (۵۴) بے شک اس میں بہت سی نشانیاں ہیں اہل عقل کے لئے۔

آل عمران میں ہے: —

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ - (۱۱۲) بے شک اس میں سامان عبرت ہے اہل بصیرت کے لئے۔

اسی عام اسلوب کے مطابق سورہ فجر میں تمہیں کھانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ ان قسموں کے اندر اہل عقل و بصیرت کے لئے بہت سے دلائل پوشیدہ ہیں —

سورہ واقعہ کی تفسیر بھی اس سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔ فرمایا ہے: —

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ الْجُودِ وَإِنَّ الْكُفْرَ لَكَبُودٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ - (۴۵ - ۴۶) سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈھلنے اور ڈوبنے کی جگہوں کی اور بلاشبہ یہ ایک عظیم الشان قسم ہے اگر تم لوگ مانو۔

یعنی اس میں بہت بڑی دلیل اور ایک عظیم الشان شہادت ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ قسم کی بڑائی کی تصریح فرمائی ہے مقسم بے عظمت کا ذکر نہیں فرمایا —

بالمعوم مقسم بہ کا ذکر ایسے صفات کے ساتھ ہوتا ہے کہ اس سے استدلال مترشح ہوتا ہے۔ مثلاً —

وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ - (الحجۃ - ۱) شاہد ہے تیرا جب مائل ہو۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنُفِ الْجَوَّارِ الْكُنَّسِ - (النجم - ۱۵) سو نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے چلنے والے (ستاروں) کی۔

وَالصُّفُتِ صَفَاءَ فَالْزَّجْرَاتِ زَجْرًا - قسم ہے ان کی جو صف باندھتے ہیں پھر ڈالتے ہیں پھر دنگی

قَالَتِلَيْتِ ذِكْرًا (الصفۃ - ۱-۳) تلاوت کرتے ہیں

وَالذَّرِيتِ ذُرًّا فَالْحَمِلَتِ وَفَرًّا - قسم ہے ہواؤں کی جو اُڑاتی ہیں غبار پھراٹھالیتی ہیں بوجھ،

فَالْجُرَيْتِ يَمْرًا فَالْمُقَسِّمَتِ أَمْرًا (الذاریات) پھر چلنے لگتی ہیں آہستہ۔ پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملہ کو۔

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (القیامۃ - ۲) اور نہیں، میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی۔

غور کرو تاروں کا گرنا اور پیچھے ہٹنا، ملائکہ کی صف بندی، ہواؤں کی غبار انگیزی اور تقسیمِ امر، نفس کی ملامت گری، ان باتوں کو استدلال سے زیادہ تعلق ہے یا ان کی تعظیم کی جارہی ہے —

۸ — بعض مقامات میں ایسا ہے کہ مقسم بہ سے پہلے عام دلائل و آیات کا ذکر ہوا ہے۔ پھر اس کے بعد مقسم بہ ایسے انداز سے آیا ہے کہ انگلی اٹھا کر تمام کھلی دلیلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے، گویا استدلال کا جو پہلو مد نظر تھا اس کی تہید پہلے ہی سے جمادی گئی تھی، ایسے مواقع نظم قرآن کے طالب کے لئے بڑے نشاط انگیز ہوتے ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھنا چاہیے۔ سورہ ذاریہ میں فرمایا گیا:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُوقِنِينَ وَفِي الْأَنْفُسِ كُودٌ - اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود

أَفَلَا تَبْصُرُونَ وَفِي السَّمَاءِ مَرَدُّكُمْ كُودٌ - تمہارے اندر بھی کیا تم نہیں دیکھتے؟ اور آسمان میں تمہاری

روزی ہے اور وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

یعنی آسمان و زمین میں خدا کی پروردگاری اور روزِ جزاء کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقامات میں اس کی

تفصیل فرمائی ہے، پھر آسمان و زمین کے دلائل جزا کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا:۔

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّكَ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكَ تَنْطِقُونَ (الذاریات ۲۳) | پس آسمان اور زمین کے پروردگار کی قسم، یہ بات حق ہے جس طرح کہ تم بولتے ہو۔

”وہ“ سے مراد اس آیت میں جبراء ہے جن لوگوں نے یہاں قرآن فراد لیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ اس قسم پر جرم کر غور کرو۔ اس میں تعظیم کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ قسم اللہ تعالیٰ کی کھائی گئی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں آسمان اور زمین کی نشانیوں سے استدلال کا پہلو نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ چنانچہ مقسم بہ کا ذکر ایسی صفت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جو مابقیہ استدلال کی طرف خود اشارہ کر رہی ہے اور چونکہ اس میں تعظیم کا پہلو زیادہ بھرا ہوا تھا تو ممکن تھا کہ استدلال کے پہلو کو ذرا دیتا اس لئے مناسب ہوا کہ استدلال کی تہید پہلے استوار کی جائے۔

قسم کی بلاغتیں

_____ ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ اگر یہ قسمیں دلیل ہیں تو ان کو دلیل کے صاف اسلوب میں کیوں نہیں پیش کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ استدلال کی مختلف مالیتیں ہیں، بعض مرتبہ استدلال ایسے امور پر ہوتا ہے جن میں نفرت یا رغبت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس کی نہایت واضح مثالیں علوم طبیعی، ریاضی یا بالعموم تاریخ میں مل سکتی ہیں۔ ایسے مواقع پر بلاشبہ استدلال کا کوئی واضح اسلوب ہی موزوں ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض اوقات استدلال کا تعلق ایسے نفسیاتی امور سے ہوتا ہے جن میں منکرم و مخاطب دونوں طرف سے ترغیب و انکار، زجر و اعراض اور ضد و اصرار کی ایک خاص کشاکش ظہور میں آجاتی ہے۔ ایسے مواقع میں ضرورت پیش آتی ہے کہ دلیل کو مختلف صورت اور بھیسوں میں پیش کیا جائے اور کلام کے ایسے ڈھب اختیار کئے جائیں جو وضاحت و لطافت اور قوت و شدت کے اعتبار سے متفادت ہوں، یہی نکتہ ہے کہ بعض مرتبہ اسلوب کلام بدل دیا جاتا ہے۔ تاکہ مخاطب ایک ہی انداز کی گفتگو سے بے مزہ نہ ہو اور اگر ایک اسلوب کلام اس پر مؤثر نہیں ہوتا تو دوسرا اختیار کیا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ کچھ کارگرم ہو۔ قرآن مجید نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

الْظُّرُكَيْفَ لَصَرَفُ الْاِيَاتِ لَعَلَّهُ يُفْقَهُمْ سُورَتِ - (الانعام ۵۵) | غور کرو کس طرح ہم اپنی آیتیں ہمیر پھیر کر بیان کرتے ہیں۔ تاکہ وہ سمجھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بادشاہ سے مجادلہ کیا تھا، اس کے ساتھ بھی آپ نے یہی انداز اختیار کیا، جب دیکھا کہ جوہل انہوں نے مخاطب کے سامنے پیش کی ہے، اس کو وہ نہیں سمجھ رہا ہے۔ انہوں نے اس کو ترک کر کے فوراً دوسری دلیل اختیار کر لی اور پہلی دلیل پر اصرار مناسب نہیں سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معترض اس دوسری دلیل کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا۔

یہ شیے کا اجمالی جواب ہوا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اسلوب قسم کے اندر محاسن بلاغت کے جو گونا گوں پہلو موجود ہیں، ان میں سے بعض کی طرف یہاں اشارہ کریں۔

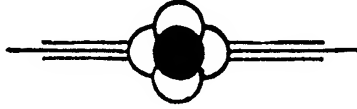
_____ اس اسلوب سے قول کی کجنگی اور تاکید کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں رسولوں کا قول مذکور ہے۔

قَالُوا رَبَّنَا عَلِّمْنَا لَكَ مَا نَشَاءُ اِنَّكَ لَمُرْسِلُونَ وَمَا | کیا ہمارا پروردگار شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف بھیجے گئے ہیں۔

عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ (س ۱۶-۱۷) — اور نہیں ہے ہماری ذمہ داری مگر کھلے طور پر پہنچا دینا۔
سورہ طارق میں ہے :-

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ | اور شاہد ہے آسمان پر نگار اور زمین پر رشکاف کہ یہ دو لوگ
إِنَّهُ لَقَوْلُ فَصْلٍ وَمَا هُوَ إِلَّا هَزْلٌ (۱۱-۱۳) | بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے —

اور عرب اس بات کو جانتے تھے کہ ایک شہر لیف انسان جب کسی بات پر قسم کھاتا ہے تو اس سے اس کا مقصود بات کی
سچائی اور واقعیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوائل نبوت میں قسمیں زیادہ ہیں تاکہ لوگوں کے سامنے معاملے کی اہمیت اور سنجیدگی پوی
طرح واضح ہو جائے اور یہ چیز خود اسلوب قسم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس میں تعظیم کا کوئی پہلو ہوتا ہے۔



قرآن حکیم اور اکتشافِ جدیدہ

مولانا محمد شہاب الدین ندوی لکھتے ہیں: —

حُنیائیں قرآنِ کریم ہی ایک ایسی زبردست علمی کتاب ہے جس نے انسانی ذہن و فکر پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور روزِ اوّل ہی سے بحث و مباحثہ اور فکر و نظر کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ اس کی موافقت و مخالفت پر اتنا کچھ کہا اور لکھا گیا ہے کہ شاید ہی کسی دوسری کتاب پر کہا اور لکھا گیا ہو — یہ سلسلہ برابر جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا —

آج کل موضوعِ سخن یہ بنا ہوا ہے کہ قرآنِ عہرِ جدید کے تقاضوں کا کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے؟ جدید حقائق اختلافِ آراء اور سائنٹیفک اکتشافات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت کہاں تک رکھتا ہے اور موجودہ بدلے ہوئے حالات میں انسان کی رہنمائی کہاں تک کر سکتا ہے وغیرہ۔ اس سلسلے میں اُس کے مخالفین کا تو ذکر ہی کیا خود اُس کے حامی اور متبعین تک مختلف و متضاد نظریات رکھتے ہیں —

۱ — ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن مجید محض دینی و شرعی احکامات کا مجموعہ ہے وہ لوگوں کو مراسمِ عبودیت سکھانے کی خاطر نازل ہوا۔ کائنات اور اُس کے حقائق سے اُس کو کوئی بحث ہی نہیں ہے —

۲ — دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قرآن سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنے اور زمین کے مادی و پوشیدہ غنائوں سے مستفید ہونے کی دعوت دیتا ہے لہذا مادیات میں ترقی کر کے کائنات کی تسخیر کرنا ہی اسلام اور خلافتِ الہیہ کا اصل منشا ہے —

۳ — کسی کا اعتراض ہے کہ قرآن میں جب ”سب کچھ“ مذکور ہے اور تمام ایجادات و اکتشافات کا تذکرہ کر دیا گیا ہے تو پھر خود مسلمان اس درجہ پسماندہ کیوں ہیں اور سائنسی علوم میں ترقی کر کے چاند ستاروں وغیرہ پر کیوں نہیں پہنچ سکتے؟ —

۴ — کوئی معترض ہے کہ جب قرآن میں چاند کی تسخیر وغیرہ کا ذکر موجود ہے تو پھر قدیم مفسرین نے اس کا تذکرہ نہیں کیا؟ کیا وہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے تھے؟ —

۵ — کوئی اعتراض کرتا ہے کہ قرآن کریم کو عصری ایجادات و اکتشافات کا پابند بنادینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اور یہ سلسلہ تک چلتا ہے گا —

صحیح نقطہ نظر

واقعیہ یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام نظریات و اعتراضات افراط و تفریط کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا بنیادی مقصد تو نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی ہی ہے مگر وہ فکر و نظر کی اصلاح اور غلط افکار و معروضات کی تردید کی خاطر کائنات کے حقائق سے بھی بحث کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ دین اور شرعی امور کا تذکرہ تو نہایت واضح انداز میں اور پوری صراحت کے ساتھ کرتا ہے تاکہ اُس کے ماننے والوں کو کبھی بھی دوسری اپنے معاملات زندگی کے سمجھنے میں اشتباہ نہ پڑے اور وہ ہر دور میں صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ اس کے برعکس وہ امور جو تکوین یا فطرت (NATURE) سے متعلق ہوتے ہیں ان کو محض اشارہ دل کنیوں کی زبان میں ایک خاص انداز اور ایک خاص اسلوب کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ جن کا صحیح مفہوم

اور صحیح مطلب اُسی وقت واضح ہو سکتا ہے جب کہ تحقیق و تفتیش کے باعث کائنات کے اسرار اور قدرت کے مخفی رازوں کا افشا ہو جائے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قسم کی آیات کا مفہوم ہر دور میں بدلتا رہے گا۔ بلکہ دراصل قرآنی آیات کی ساخت و ترکیب اور ان کے الفاظ و معانی میں بڑی وسعت اور حیرت انگیز لچک رکھی گئی ہے۔ اس درجہ جامعیت اور خوبی کے ساتھ کہ ہر دور کے معلومات و اکتشافات کی بدولت ان کے نئے نئے پہلو بھی اُجاگر ہوتے جائیں اور ان کا قدیم مفہوم بھی غلط نہ ہونے پائے بلکہ مزید گنجائش نئے نئے معانی و مطالب کے اخذ و استفادہ کی برابر باقی رہے۔

میں اس موقع پر ایک مثال پیش کروں گا جس کے ذریعہ یہ مسئلہ بھی بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا اور اس سلسلے کی بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ قرآن حکیم میں کہا گیا ہے: —

”ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی ہی سے پیدا کیا ہے۔“

موجودہ دور سے پہلے اس کا مطلب یہ لیا جاتا رہا کہ تمام حیوانات لطفہی سے وجود پذیر ہوتے ہیں جو پانی ہی کی ایک شکل ہے یا مجازاً اس کو پانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مفہوم اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھا اور ہے۔ مگر جدید سائنسی تحقیقات کی بدولت ایک نیا مفہوم سامنے آیا ہے جس کے پیش قرآن حکیم کے حیرت انگیز اعجاز کا حال بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حیاتیات (BIOLOGY) کی ترقی کی بدولت اس بات کا پتہ لگایا جا چکا ہے کہ تمام حیوانات و نباتات کی تشکیل یکساں قسم کے مادہ سے ہوئی ہے اور خوردبینی مشاہدہ سے پتہ چلا ہے کہ حیوانات و نباتات کے اجسام نہایت درجہ ننھے ننھے خلیوں پر مشتمل ہیں، ان خالوں میں ایک لیسدار، چپ چپا اور متحرک مادہ بھرا رہتا ہے جس کو پروٹوپلازم کا نام دیا گیا ہے اور کیمیائی تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ اس مادہ کا اکثر دو بیشتر حصہ پانی پر مشتمل ہے۔ اب غور فرمائیے کہ ”قرآن کریم کا یہ بیان کہ ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی ہی سے بنایا ہے“ کس قدر بلیغ اور حکیمانہ ہے وہ نہ تو حیوانات و نباتات کا نام لیتا ہے نہ پروٹوپلازم کا ہی کوئی ذکر کرتا ہے بلکہ ایسے جامع الفاظ استعمال کرتا ہے جو اس جدید حقیقت اور پروٹوپلازم کے اکتشاف کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ جیسا کہ ”کل شئی حتیٰ ابر جاندار چیز کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے یہ قرآن مجید کا معجزہ نہیں تو پھر کیا ہے؟۔“

یہ محض ایک مثال ہے اس پر دوسرے امور کو بھی قیاس کر لیجئے کہ قرآن حکیم کے حیرانگیز بیانات میں جدید سے جدید تر تمام تحقیقات کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی گنجائش روزِ ازل ہی میں رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ معجزانہ خصوصیت وہی عظیم ترین ہستی رکھ سکتی ہے جس کا علم تمام زمانوں کو محیط ہو اور جس کی نظروں سے قیامت تک واقع ہونے والی کوئی بھی حقیقت اوچھل نہ ہو۔ اس ملاحظہ سے حسب ذیل حقائق بے نقاب ہو جاتے ہیں: —

- ۱۔ قرآن حکیم میں قدرت کے مخفی رازوں کا بیان ایک خاص انداز میں موجود ہے۔
- ۲۔ قدرت کے یہ بھید سائنس کی ترقی کے بعد ہی ظاہر و منکشف ہوتے ہیں۔
- ۳۔ قرآنی آیات میں لچک اور وسعت رکھی ہوئی ہے اور وہ تحقیقات جدیدہ کو اپنے دامن میں سیرط لینے کی صلاحیت و استعداد رکھتی ہیں۔

- ۴۔ نئے مفہوم کو لینے سے پرانا مفہوم بالکل غلط یا باطل نہیں ہو جاتا بلکہ اس پر کمرہ کا ایک نیا پہلو جلوہ گر ہوتا ہے۔
- ۵۔ اس سے نہ تو اگلے مفسرین کی کوئی تنقیص ہوتی ہے اور نہ ان پر قرآن حکیم کو ٹھیک طرح سے نہ سمجھ سکے کا الزام ہی لازم آتا ہے کیونکہ انہوں نے جو کچھ بھی بیان کیا تھا وہ اپنے دور کی معلومات کے مطابق بالکل صحیح تھا۔

۶۔ نئے مفہوم کو لینے سے جدید تفسیر کی شان کچھ دو بالا نہیں ہو جاتی، کیونکہ اُس نے جو مفہوم لیا ہے وہ موجودہ تحقیقات و انکشافات کے عین مطابق ہے۔

۷۔ قرآن حکیم کے نئے نئے مصادیق و مطالب کا یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ:۔
 ”قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہ ہو سکیں گے“ (ترمذی)

سائنس اور مسلمان
 مذکورہ بالا حقائق کے ملاحظہ کے بعد یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں جب تمام ایجادات و انکشافات کا بیان موجود ہے تو پھر مسلمان پس ماندہ اور خستہ حال کیوں ہیں؟ ظاہر ہے کہ راز ہائے قدرت کی دریافت کے بعد ہی قرآن کے اشارات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اس سے پہلے ان حقائق کو کھنڈنا مشکل ہے تو پھر ان حقائق سے قبل از وقت واقف ہو کر ترقی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نیز اس سے یہ نظریہ بھی غلط ہو جاتا ہے کہ قرآن کی اصل دعوت مادی قوتوں کو زیر کر کے مظاہر فطرت سے استفادہ کرنا اور معیار زندگی کو بلند کرنا ہے۔ اگرچہ وہ مادی مظاہر سے استفادہ کا اصلاً مخالف نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مجموعی اعتبار سے کائنات کے نظام میں غور و فکر کرنے اور اس کی مشنری کو سمجھنے کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ جگہ جگہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کائنات کے مخفی گوشے سامنے آتے ہیں اور متمدن بھی ترقی کرتا جاتا ہے، جس کی بدولت جسمانی راحت و آسائشوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

تہذیب و افکار
 اب حل طلب مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اصل حقیقت جب یہ ہے تو پھر قرآن مجید میں اس درجہ ایجاد و اختصار اور رمز و کنایہ کی آخر ضرورت ہی کیا تھی اور اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں حسب ذیل حقائق پر نظر رہنی چاہیے:

۱۔ سب سے پہلے اور بنیادی وجہ سے کہ انسانی ذہن و دماغ کو قابو میں رکھا جائے اور اُس کو کسی طرح بھی بہکنے نہ دیا جائے یعنی کائناتی علوم کی ترقی اور مختلف ایجادات و انکشافات کے ظہور کے باعث انسان مغرور و خود مہر ہو کر خدا کا انکار نہ کر بیٹھے۔ لہذا اُس کو الحاد و لادینیت کے مضر اثرات سے بچانے کے لئے ایسے دلائل فراہم کرنا ضروری ہے جو خدا پرستی کی تصدیق و تائید کرنے اور انسان کے باغیانہ رویہ کی مذمت و بُرائی بیان کرنے والے ہوں۔ قرآن کے سائنٹیفک بیانات سے دراصل ہی دلائل و شواہد فراہم کر کے منکرین و معاندین پر تمام حجت کرنا مقصود ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ان دلائل و شواہد کو ”آفاقی و نفسی دلائل“ کہا جاتا ہے۔ ۲۔ اسلام، انسان کو تمدنی ترقیوں سے نہیں روکتا بلکہ اُس کے باغیانہ رویہ پر قدغن لگا تا ہے۔ سائنسی ترقیوں کے بدولت انسانی تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے وہ ہر دور کے تقاضے کی مطابق انسان کو غلط روی سے بچاتا اور اُس کے فکر و نظر کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ یہی قرآن عظیم کی اصل ہدایت اور اُس کا سب سے بڑا انجاز ہے۔

۳۔ قرآن عظیم کی یہ ہدایت ہر دور کے تقاضے کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی اور وہ کبھی فرسودہ یا اوٹ آف ڈیٹ ہونے نہ پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اس لافانی صحیفہ کو کائنات کے تمام بنیادی رازوں کا امین بنا دیا گیا ہے۔

۴۔ خدا پرستی کے اثبات اور خدا بیزاری کے ابطال کے لئے جتنے بھی علمی و عقلی اور سائنٹیفک دلائل ممکن ہو سکتے تھے وہ سب قرآن حکیم میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ کائنات کے حقائق یا قوانین فطرت (LAWS OF NATURE) کو بنیاد بنا کر دراصل اپنی علمی و سائنٹیفک دلائل کا اظہار مقصود ہے، تاکہ ان کے ذریعہ ہر دور کی ذہنی پیداوار کے مطابق اُس کی دعوت و ہدایت پر اثر انداز ہونے والے اعتراضات کا قلع و قمع ہوتا ہے۔

۵۔ قرآن مجید کا سب سے بڑا کاغذ نامہ یہ ہے کہ وہ انسان کو کائنات کے متعلق سوچ بچار کی غلط راہوں اور غلط سمتوں کی طرف جملے نہیں دیتا اور اسل راہ (صراطِ مستقیم) سے ذرا بھی بھٹکنے نہیں دیتا، بلکہ جگہ جگہ اُس کو لوٹتا اور اُس کے فکر و نظر کی اصلاح و تکرار کرتا رہتا ہے۔ اس قسم کے دلائل و شواہد کی مثال کے لئے قرآن حکیم کے مذکورہ بالا بیان ہی کو لے لیجئے: "اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کو بنایا ہے۔" اس ایمان آفرین حقیقت کے ملاحظہ سے سب سے پہلے اور اولین طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس کائنات میں ایک عامل ترین ہستی کا وجود ضروری ہے جس کا وجود نہ صرف اُزلی ہے بلکہ اُس کی باتیں بھی کبھی نہیں بدلتیں اور اُس کے کلام کی سچائی ہر ذرہ میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں یہ زبردست خصوصیت کسی انسانی کلام میں نہیں پائی جاسکتی، اس لحاظ سے قرآن عظیم کلام الہی قرار پاتا ہے۔ اور دوسری حیثیت سے غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ محض پانی جیسی سادہ چیز سے ایک حیرت انگیز مادہ (پروٹوپلازم) پیدا کر دینا اور اس مشترکہ مادہ کے ذریعہ مختلف اور گونا گوں خصوصیت رکھنے والے قسم ہا قسم کے حیوانات و نباتات کی تخلیق کر دینا ربوبیت کا ایک ہی ترناک کرشمہ اور شاندار معجزہ نہیں تو پھر کیا ہے؟۔

تیسری حیثیت سے نظر کیجئے تو معلوم ہو گا کہ دنیائے سائنس جس مادہ اولیٰ کو پروٹوپلازم کہتی ہے اُس کی مکمل ماہیت و حقیقت کی وہ اب تک راز جوئی نہیں کر سکی اور نہ اس راز سر بستہ کی نقاب کشائی ہی کر سکی ہے کہ یہ پراسرار مادہ ابتدا کیسے اور کس طرح وجود میں آگیا! عبرت کی بات تو یہ ہے کہ وہ پروٹوپلازم میں پائے جانے والے عناصر مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائٹروجن وغیرہ کو جب اسی مقدار میں اکٹھا کرتی ہے تو اس سے پروٹوپلازم (زندہ و متحرک مادہ) نہیں بن پاتا اور اس میں حرکت و زندگی کی کوئی رمق بھی نمودار نہیں ہوتی۔

دنیائے سائنس کی اس ناکامی و نامرادی سے ملحدوں کا یہ نظریہ باطل ہو جاتا ہے کہ یہ عظیم الشان کائنات خود بخود وجود میں آگئی ہے اور "زندگی" محض سخت و اتفاق کی پیداوار ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں ایک باشعور و بارادہ ہستی کا وجود ضرور ہے جو نہایت درجہ حکمت و دانائی کے ساتھ مظاہر کائنات کی دیکھ بھال کر رہی ہے یہی خدا ہے جس کا وجود ایک زندہ و تابندہ واقعہ ہے۔ لہذا موجودہ نام نہاد روشن خیالی کے مطابق خدا کے وجود کا اقرار جہالت و نادانی کی بات نہیں بلکہ اس کا انکار درحقیقت جہل و نادانی کا مظہر ہے، اسی لئے قرآن حکیم میں مذکورہ بالا بیان کے آخر میں کہا گیا ہے: "أَفَلَا يَتُوبُونَ" کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے؟۔ یہ ہے قرآن حکیم کے آفاقی و فلسفی دلائل کی حقیقت و نوعیت اور اُس کی ایک جھلک۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم صرف علمی انکشافات ہی نہیں کرتا بلکہ وہ باطل سے ہر آزمائی کے طریقے بھی سکھاتا ہے۔ بشرط صرف یہ ہے کہ عصری علوم سے بھی استفادہ کیا جائے اور غور و خوض کر کے قرآن حکیم کے بلیغ اشارات کو سمجھنے کی بھی کوشش کی جائے۔

کائنات کے ملاحظہ و جائزہ سے دراصل ایک زبردست اور قادر ترین ہستی کا وجود ثابت ہوتا ہے اور قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک عالم ترین ہستی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یہ کائنات خداوند جل جلالہ کی قدرت کاملہ کے آثار ہیں۔ تو قرآن حکیم اُس کے علم اُزلی کا نمونہ اور ان دونوں کی تطبیق و ہمنائی سے عرفانِ حق حاصل ہو جاتا ہے اور غلط و دوراز کار فلسفیانہ نظریات و تخیلات کے تانے بانے ٹوٹ جاتے ہیں، یہ ہے وہ بنیادی وجہ جس کی بناء پر قرآن میں کائنات اور اس کے اسرار و حقائق سے بحث کی گئی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قرآن محض علومِ طبیعی (PHYSICAL SCIENCES) کے انکشافات کا خبر نامہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں تسخیر کائنات اور افاقی دلائل کا مقصد

قرآن کریم نہ تاریخی کتاب ہے کہ محض واقعات کی تفصیل ہی بیان کرتا ہے اور نہ ہی طبعی نوامیس کی تفصیل بیان پر مشتمل کتاب طبیعات ہے کہ محض علمی افسانوں میں وقت ضائع کرے، وہ تاریخی کی روح پیش کرتا ہے اور طبیعات کے فکرو عمل کے نتائج بیان کرتا ہے جس سے توحید الہی، خلق و ربوبیت کے حقائق انسان کے دل و دماغ میں پیوست ہوں اور رُوح کو پاکیزگی حاصل ہو۔ قرآن اگر کائنات میں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے تو اس کی غرض و غایت یہی ہوتی ہے کہ انسانی ذہن و فکر کے سامنے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ کھل جائے اور اس غور و فکر کے بصیرت آموز نتائج سے ایمان بالغیب کی تائید اور پرورش ہو، اس لئے کہ ان حقائق کو نبیہ اور حقائق الہیہ میں غور و غوض سے ایمان قوی ہوگا، وہ ان کی طرف محض علم و فن کی حیثیت سے کبھی دعوت نہیں دیتا کہ محض فن ہی کو مقصد بنا لیا جائے۔

قرآن کریم کے بعض جدید مفسرین کو اسی سلسلہ میں بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، انہوں نے ان موضوعات میں محض قرآنی مباحث کی تفسیر اور ان مباحث کی غرض و غایت بیان کرنے میں بڑے غلو سے کام لیا ہے اور یہ حقیقت ان لگا ہوں سے اوجھل ہو گئی ہے کہ قرآن اگر طبیعات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مقصد بھی معرفت الہی تک پہنچنا ہے اور کسی جگہ ان طبعی مسائل کو خدمت خلق کا ذریعہ بنایا جائے ظاہر ہے کہ ذات و صفات الہی کے سچے بیکار میں شناوری کا صرف یہی ایک راستہ ہے کہ انسان ان حقائق میں غور کرے تاکہ اس وادی میں ان کے فکر و نظر کی صلاحیتیں زیادہ وسیع ہوں اور ان کے سامنے معرفت الہیہ کے نئے نئے باب کھلیں اور جب اس طرح قلب و رُوح کی تربیت ہو جائے اور انسان کا صحیح شعور بیدار ہو جائے تو علمی دائرہ کا صحیح مقصد بھی خود بخود متعین ہو جاتا ہے

اس تمام بحث و تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور کونیات حق تعالیٰ کے کمالات قدرت اور صفات جلال و جمال کا ایک صحیفہ ہے جس کے مطالعہ سے اور اس میں غور و فکر کرنے سے ایمان میں سختگی پیدا ہوتی ہے اور اس حیثیت سے طبیعات کے جدید علوم ان اصحاب کے لئے بلاشبہ بصیرت افزا اور بحد بصیرت افزا ہیں جن کو وحی کی راہ سے وصول الی اللہ حاصل نہ ہو۔ معرفت الہیہ ان علوم پر منحصر نہیں ہے بلکہ ظاہرین اصحاب کے لئے حصول معرفت کا یہی ایک راستہ باقی رہ گیا ہے۔

علمی معارف کے بعد علمی نتائج ہیں اور اس علم و عمل سے حقیقی فوائد حاصل کرنے کے لئے صحت مقصد کی ضرورت ہے اور صحیح مقصد کی ضرورت اور تصحیح مقصد کے لئے ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت کے سوائے کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔ ایمان یقین سے محرومی اور بے مقصد علم و عمل ہی کی وجہ ہے کہ رُوس امریکہ اور یورپ کی قومیں ان سائنسی ترقیات اور معجزات عقول و ابدان کے باوجود انسانیت کی صفوں سے نکل کر پوری درندگی کی حدود تک پہنچ چکی ہیں۔

ایک طرف سائنس کی موجودہ ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات و اختراعات کو دیکھ کر عقل و دماغ رہ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

انسانی عقل میں کیا کیا صلاحیتیں رکھی ہیں اور جب ان صلاحیتوں سے کام لیا گیا ہے تو عقل نے کہاں تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر سائنس دانوں کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صورت کمال کا صرف ایک ہی رخ ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان آیات قدرت اور عجائبات خلق و تکوین کو دیکھنے کے بعد بھی وہ اب تک اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں لاتے اور ایمان باللہ کی ذلت سے محروم ہیں۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ یہی عقلاء و فکرو و لفظ کے اس رخ پر اس قدر باطل کیسے رہ گئے، لیکن حق تعالیٰ ان کے اس کفر و انکار کی حقیقت سے بھی پردہ اٹھاتا ہے۔ ارشاد ہے: —

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ

دُنیا کا بھی ظاہر اور وہ بھی ہمہ بہت محدود مقدار میں جانتے ہیں، ان کا ذہن اور ان کی فکرو و لفظ اس طرف باطل نہیں جاتی کہ اس تجرُّدِ کائنات اور پُر اسرار حقائق مخلوقات کے خالق پر ایمان لائیں، ایک طرف یہ ذہانت — اور تجرُّدِ ذہانت اور دوسری طرف اس قدر غباوت اور غیر معمولی غباوت بجائے خود کس قدر عجیب اور حیرت ناک ہے —

پہلے اس سے کہ ہم کلمہ تسخیر کے معنی بیان کریں۔ قرآن کریم کی ان آیات ربّانی سے سرسری طور پر جن حقائق کی طرف رہنمائی ہوتی ہے ان کو اجمالاً پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ —

۱۔ یہ تمام کارخانہ قدرت جس میں آسمان، زمین، چاند، سورج، سمندر اور دریاؤں کا حیرت انگیز نظام جسے نظام شمسی کہا جاتا ہے قائم ہے۔ یہ پورا نظام عالم انسان کی خدمت و آسائش کے لئے ہے۔ —

۲۔ یہ تمام عالم بحکومت حق تعالیٰ کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔ اسی کے تصرف میں ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ اس کی عظمت و جلال کی نشانیاں ہیں۔ —

۳۔ ان ملکوتی عجائب میں غور کرنے والے یقیناً خالق کائنات کی عظمت کے قائل ہوں گے اور اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ کارخانہ کسی عظیم ترین مقصد کا پیش خم ہے اور اس کا نتیجہ فوق العادت نکلنے والا ہے نہ یہ از خود وجود میں آیا ہے نہ ہی بے مقصد ہے یہ تخلیق بھی اس کی ہے۔ اس پر اقتدار تصرف بھی اسی کا ہے

۴۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی علت اور سبب کو دریافت کیا، جواب میں سبب بتلانے کی بجائے مقصد سے آگاہ کیا گیا۔ کہ یہی معلوم کرنا اہم اور کارآمد ہے۔ باقی سبب و علت یہ تو عقلی چیز ہے۔ خود مشاہدات و تجربات سے سمجھ جائیں گے۔ اصلی مقصد اس نظام کے منشاء قدرت کو سمجھنا ہونا چاہیئے۔ سو اس کو بتلادیا

تسخیر کے معنی عربی لغات میں تسخیر کے معنی ہیں، کسی چیز کو اپنے ارادہ کے تابع کر لینا یا کام میں لگا لینا اور اس طرح مجبور کرنا کہ وہ خلاف نہ کر سکے، چاند، سورج، رات دن اور کائنات کے تمام ستاروں اور تاروں کی تسخیر کی حقیقت یہ ہے

کہ ان سب کو حق تعالیٰ نے ایک ایسے نظام میں منسلک کر دیا ہے۔ کیا مجال ہے کہ اس مقرر کردہ نظام سے سر ہو تجاؤز و کرکیں۔ حق تعالیٰ کی محبوبی اور تخلیقی نظام کے مطابق یہ سب اپنے اپنے مدارات پر متعلق ہیں اور ایک نظام کے سخت چل رہے ہیں۔ یعنی اپنا اپنا کام انجام دے رہے ہیں۔ اور یہ تسخیر حق تعالیٰ کے ارادہ و اختیار اور تصرف و اقتدار کا کرم ہے۔ انسانی دسترس سے بالاتر ہیں۔ یہ تسخیر فزہ کائناتی اشیاء، اسٹیار کوئز میں اور ان کو مسخر کرنے والی صرف حق تعالیٰ کی ذات جل ذکرہ ہے اور جس کے لئے ان کو تسخیر کیا گیا وہ حضرت انسان ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقت کی رائے انسانی ارادہ و اختیار اور تصرف و اقتدار کو اس نظام کائنات میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں۔ نہ اس نظام کو روک سکتا ہے، نہ بدل سکتا ہے۔

قرآن میں شریک تصوات کا حتمی انکسار

جہاں تک توحید اور شرک کا تعلق ہے قرآن کا تصور اس درجہ کامل اور بے لکھ ہے کہ اس کی کوئی نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔ اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو۔ کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی دوسری ہستی اس کی ذات میں شریک دیکھ مان لی جائے۔

ایجابی پہلو یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ پہلی سب سے کہ اس کی مانند کوئی نہیں اور جب اس کی مانند کوئی نہیں تو ضروری ہے کہ جو صفات اس کے لئے مخصوص ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید فی الذات ہے اور دوسری توحید فی الصفات ہے۔ توحید فی الذات سے پہلے اقوام عالم کی استعداد اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی ذرا کمزوری کی تحمل ہو سکتی۔ اس لئے ان مذاہب نے قسم تو روز توحید فی الذات ہی پر دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔

لیکن قرآن نے توحید فی الصفات کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام ذرائع بند ہو گئے۔ اگر پہلے صرف توحید ہی پر زور نہیں دیا بلکہ شرک کی راہیں بھی بند کر دیں اور یہی اس باب میں اس کی خصوصیت ہے۔

وہ کہتا ہے ہر طرح کی عبادت اور نیازی کی مستحق صرف خدا ہی کی ذات ہے۔ پس اگر تم نے عبادت تمہارے دنیا کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے ساتھ سر جھکا یا تو توحید الہی کا اعتقاد باقی نہ رہا۔ وہ کہتا ہے۔ یہ اس کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ پس اگر تم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا تو خدا کے درجے سے مہر دیت کی یگانگی باقی نہ رہی۔ اس طرح عقیدتوں، کبریاؤں، کارسازوں اور بے نیازوں کا جو اعتقاد تمہارے اندر خدا کی حسی کا تصور پیدا کرتا ہے۔ وہ صرف خدا ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیے، اگر تم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لئے بھی پیدا کر لیا تو تم نے اسے خدا کا بدلہ یعنی شریک ٹھہرایا اور توحید کا اعتقاد درہم دہم ہو گیا۔

یہی وجہ ہے کہ سورہ فاتحہ میں "إِيتَاكَ ذُحُبًا وَ إِيَّاكَ" کی تفسیر کی گئی اس میں ازل تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا، پھر وہ لوں بلکہ مفلوں کو بھی مقدم کیا جو مفید حسرت یعنی "صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد طلب کرتے ہیں"۔ اس کے علاوہ تمام قرآن میں اس کثرت کے ساتھ توحید فی الصفات اور ذرا شریک پر زور دیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی صورت ہو کہ کوئی مفسر اس سے غافل ہو۔

مجلس نشر السنۃ
مخدوم رشید
(ملتان)

اس وجہ سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانہ میں قصہ گوئیوں کو مسجدوں میں بیٹھنے کی ممانعت کر دی۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ تفسیر کا علم زیادہ علماء متکثر میں تھا جو حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد تھے۔ مثلاً عکرمہ، مجاہد اور عطاء، پھر اہل کوفہ میں جو حضرت ابن مسعودؓ کے اصحاب تھے جیسے حسن بصریؒ اور سروق وغیرہ۔

اس عہد میں اسرائیلیات میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ عوام کار جہان ان کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ اس کو علمی تحقیق سمجھنے لگے تھے کہ قرآن میں جن انبیاء اور اقوام کے قصص ہیں، ان کے متعلق مزید حالات کا پتہ لگائیں۔ اس لئے جزئی سے جزئی اور چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی دریافت کرنے لگے۔ مثلاً سفینہ نوح کی مقدار اور وسعت، اس میں جن جانداروں کے جوڑے لائے گئے تھے، ان کے اقسام، حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں چاروں پرندوں کے واقعہ میں کے متعلق تحقیق۔

اصحاب کہف کے نام اور ان کے کھٹے کے رنگ و نسل، غرض اسی قسم کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں امور کی بابت جن کو قرآن کریم نے لالینی اور غیر ضروری ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا، بحث و تفتیش کرنے لگے، یہی معلومات روایات کے ذریعہ سے پھیلیں اور حجب تفسیر میں مدون ہوئیں تو ان میں درج کی گئیں۔ ان روایات کا سب سے بڑا مرجع دو شخص ہیں۔ ایک کعب بن مائع جو یمن کے یہودی تھے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لائے اور مدینہ میں رہنے لگے۔ یہ کعب احبار کے نام سے مشہور ہیں ان سے حضرت عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے توسط سے زیادہ روایتیں آئی ہیں۔ دوسرے وہب بن منبہ، یہ بھی یمن کے یہودی اور فارسی الاصل تھے، ان کی وفات صنعاء میں ۳۱۱ھ میں ہوئی۔ اسرائیلیات میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ علماء ثقافہ مثلاً ابن قتیبہ یا امام نووی وغیرہ نے ان کی کوئی روایت اپنی کتابوں میں درج نہیں کی۔ ابن جریر طبری نے اگرچہ ان سے قطعی ہرگز تو نہیں کیا ہے مگر بہت کم روایتیں لی ہیں لیکن ثعلبی وغیرہ نے انبیاء کے قصوں میں زیادہ تر انہیں کی مرویات درج کی ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ہر حصہ سے زیادہ یہودی ثقافت یمن میں شائع تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہاں کے اہل کتاب مسلمانوں سے اس قسم کی روایتیں زیادہ منقول ہوئیں۔

زیادہ تر اسی زمانہ میں یعنی تیسری صدی ہجری میں ائمہ جرح و تعدیل نے راویوں اور روایتوں کی تنقید کی، تفسیری روایات کا بڑا حصہ بوجہ ان کے رواد کے ضعف کے مشکوک ثابت ہوا۔ کیونکہ ضحاک بن مزاحم، مقاتل بن سلیمان ابو صالح مصری، محمد بن سائب کلبی، السدی محمد بن مروان، بشیر بن عمار اور عون وغیرہ جن سے زیادہ تر یہ روایتیں آئی ہیں، جاپنچے سے کمزور بلکہ بعض ان میں وضاع لکھے۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت علیؑ اور عبداللہ بن عباسؓ کے نام سے تفسیر کی روایتیں زیادہ آئی ہیں اور یہی روایت کی کمزوری کی وجہ سے عام طور پر موضوع اور مجعول کہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے شیعہ انہیں اقوال زیادہ احترام اور قبولیت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہوں، اس لئے شیعہ رواد بیشتر انہیں کے نام روایتیں کرتے تھے، بلکہ جو بات ان کے ذہن میں ایسی آتی تھی جن سے حضرت علیؑ کا رتبہ ظاہر ہو، اس کو بھی ان کی طرف سے منسوب کر دیتے تھے۔ چنانچہ ابن ابی جرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو صوفیوں کی تفسیر سے ستر اونٹوں کا بوجھ تیار کر دوں۔ وضع کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کے نام جو روایتیں کی گئی ہیں ان کی کل تعداد ۶۸۶ ہے جن میں سے محدثین کے نزدیک اصول کی رو سے صرف پچاس صحیح ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ جن کی نسل سے خلفاء عباسیہ تھے، مقررین بارگاہ مخصوص موضوع تھے، قرآن کریم کی کوئی آیت بلکہ کوئی لفظ غالی نہ ہوگا جس کی تفسیر میں ان سے روایت نہ کی گئی ہو، ان کی کل روایتوں کی تعداد ۱۶۶۰ ہے جن میں اہم شافعی کے قول کے مطابق زیادہ سے زیادہ سو ایسی ہیں جو صحیح مانی گئی ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جتنے طرق ہیں، ان میں سب معتبر طریقہ، ابن صالح عن علی بن ابی طلحہ عن ابن عباس ہے۔ مگر جملہ حقا حدیث کا اجماع ہے کہ علی بن ابی طلحہ کی لقاء حضرت ابن عباسؓ سے ثابت نہیں ہے وہ جو کچھ ان کے نام سے کہتے ہیں۔ دراصل مجاہد اور سعید بن جبیر کی روایتیں ہوتی ہیں۔ دوسرا طریق جس کو محدثین نے شیخین یعنی امام بخاریؒ اور مسلمؒ کی شرط کے مطابق تسلیم کیا ہے قیس بن عطاء بن السائب عن سعید بن جبیر عن ابی عباسؓ نہیں۔ مگر اس سلسلہ سے صرف چند روایات ہیں۔ باقی دوسرے تمام طرق مجروح ہیں جو بر عن ضحاک سخت ضعیف سلسلہ ہے۔ ابن جریر نے جو کچھ روایت کیا ہے، اس میں صحت کا خیال ہی نہیں رکھا۔ کلبی کی روایتیں سب سے زیادہ کمزور ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ جب مردان بن محمد بھی شامل ہو جائے تو یہ سلسلہ سرتاپا کذب ہو جاتا ہے۔

یہی وجوہات ہیں جن کی بناء پر بعض اکابر ائمہ نے تفسیری روایتوں کی صحت کا سہرے سے انکار ہی کر دیا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل جو جرح و تعدیل کے امام اور بخاریؒ اور مسلمؒ کے استاد ہیں کا قول ہے کہ تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، مغازی، ملاحم اور تفسیر کے ہر چند کہ امام موصوف کے اس قول میں تاویل کی گنجائش نہیں ہے لیکن ان کے تلامذہ نے کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ بیشتر حصہ ان روایات کا ناقابل اعتماد ہے۔ غالباً اس تاویل سے ان کا منشاء یہ ہے کہ ائمہ حدیث نے جن تفسیری روایتوں کو اصول حدیث کے مطابق صحیح قرار دیا ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ جو روایتیں صحیح قرار دی گئی ہیں ان میں بھی تنقید کی ضرورت ہے مثلاً القناطیر المقطرہ کی تفسیر میں امام حاکم نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ قطار ایک ہزار اویس کا ہوتا ہے اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ بارہ ہزار اویس کا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے مگر محدثین نے دونوں کو صحیح کہا ہے۔

اب تک جتنی قدر تفسیر میں لکھی گئی تھیں وہ خالص منقولی تھیں، یعنی روایات کا مجموعہ، لیکن چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں مختلف قسم کی علمی تحریکات پیدا ہو گئی تھیں، صرف و نحو، بلاغت و معانی، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، کلام و تصوف وغیرہ کا عام رواج ہو چکا تھا، ان علوم کے حاملین نے جو تفسیریں لکھیں، ان میں بیشتر اپنے فنی زاویہ نظر سے الفاظ و آیات کی تشریح میں بحثیں شروع کیں اور روایات کے ساتھ ساتھ اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا۔ علاوہ بریں نئے نئے مذہبی فرقے بھی پیدا ہو گئے تھے، ان اہل مذاہب نے بھی اپنے اپنے عقائد و خیالات کے مطابق آیات کی تفسیریں کیں، جن کی وجہ سے اختلافات کی بہت کثرت ہو گئی اور تفسیروں کی نوعیتیں متعدد ہو گئیں، مثلاً زجاجؒ اور کسائی وغیرہ نے جو صرف و نحو کے امام تھے اپنی تفسیروں میں خصوصیت کے ساتھ لفظی تصرفات اور وجوہ اعراب سے بحثیں کیں، ثعلبیؒ اور ابن اثیرؒ نے جن کو تاریخ کا ذوق تھا قصص کی تفصیلوں کی طرف رجحان رکھا۔ فقیہ ابو اللیث سمرقندیؒ اور علامہ سمرقندیؒ نے فروع و فقہ پر آیات سے استدلال میں توجہ صرف کی۔ ابوسلم اصفہانیؒ اور زعمشیریؒ نے معتزلی عقائد کے اثبات کی کوشش کی۔ اسفرائینیؒ اور رازیؒ نے اشعرئ اصول کے مطابق مسئلہ بحثیں لکھیں، عبد القادر جرجانیؒ اور ابو ہلال عسکریؒ نے بلاغت و معانی کے لطائف ظاہر کئے، محی الدین ابن عربیؒ اور داعدی وغیرہ نے تصوف کا رنگ بھرا اور شیعہ مفسروں نے آیات کو اپنے مذہبی خیالات کے مطابق بنانے سے سرکار رکھا۔ غرض اس وقت سے

کی علمی بحثوں اور تحریکوں سے متاثر اور ہر فرقہ کی تفسیر اس کے عقائد و خیالات کی آئینہ نظر آتی ہے۔

ان وجوہات سے اگرچہ تفسیروں میں وسعت تو بہت پیدا ہوگئی لیکن بیجا تاویلات کا بھی راستہ کھل گیا اور اکثر فرقوں نے آیات قرآن کو اپنے خیالات کے مطابق اس طرح ڈھالنے کی کوششیں کیں، جن کو معنوی تحریف کہنا بجا ہے۔ اس بے اعتدالی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ تفسیر کے اصول نہیں متعین کئے گئے۔ علماء اصول نے جو کچھ لکھا ہے وہ الفاظ کے استعمال کے متعلق چند عام قیاسی قاعدے ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ علامہ فارسی نے تصریح کی ہے کہ علم تفسیر میں بجز چند امور کے اصول مطلقاً نہیں ہیں جس پر ان کی جو بیانات کا درجہ ہے۔ ان مفسرین نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے، وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے۔ یعنی فاتحہ شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور فاتحہ تک پہنچا دیتے ہیں اس طرح آیات و الفاظ کے معانی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن کچھ میں نہیں آتا، یعنی اس کی کوئی تعلیم حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں، بلکہ اس کی تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول و عرض میں بتدریج اتاری گئی ہے تا وقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے، اس مسئلہ کی پوری قرآنی تعلیم ہرگز کچھ میں نہیں مل سکتی، لہذا، ان تفسیروں نیز ترجموں سے جو سلسلہ سلسلہ آیات کے ساتھ چلتے ہیں، قرآنی تعلیمات کی توضیح نہیں ہو سکتی۔ فہم قرآن کے لئے ان تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص، آثار اور بدل وغیرہ لکھ دیئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا۔ بجنسہ اسی طرح ان تفاسیر و تراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی شخص حقائق قرآنی کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۲) اکثر تفاسیر میں آیات و الفاظ کی تشریحات روایات سے کی گئی ہیں۔ ان کا بڑا حصہ خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے۔ چنانچہ امام احمد منبہل نے جن کے اوپر حدیث کی امامت منہی ہوئی کہہ دیا ہے کہ تفسیری روایاتیں تمام تر بے اصل ہیں۔ اسرائیلیات لائی جاتی ہیں جو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ یہی حال اسباب نزول کی روایتوں کا ہے۔ قدیم مفسروں نے ان روایتوں کے سلسلہ اسناد بھی لکھے تھے، جن سے صحیح اور غیر صحیح کی تمیز ہو سکتی تھی، مگر متاخرین نے ان کو بھی حذف کر دیا۔ اور اپنی تفسیروں میں ان روایات کو بلا اسناد کے نقل کرنے لگے، جس کے باعث علوم میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیتوں کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں، یہی سبب ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوئی گئی، اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بے خبر ہوتا گیا۔

(۳) ایک خاص شکایت یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے۔ الا ماشاء اللہ زیادہ تر متقدمین ہی کی باتیں اور روایتیں نقل کرتے چلے آئے ہیں بعض بزرگ تو اس قسم کے گزروے ہیں جنہوں نے اپنی تفسیر میں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں، یعنی تقریباً اللہ خدام قرآن میں داخل ہو گئے، بحالیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے، یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں۔ اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ بیشتر اسی قسم کی تفسیریں تھیں جو معدوم یا متروک ہو گئیں، کیونکہ یہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے سکھلایا ہے کہ: **وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَمَا بَالُكُمْ فِيهِ لَا تَدْرُسُونَ** وہی چیز دنیائیں ہے گی جو لوگوں کے لئے نفع رساں ہوگی۔

جن لوگوں نے دماغ سے کام لیا ہے، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہوں نے اپنے خاص عقیدوں کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض نے محض جلدتِ طبع دکھائی ہے، مثلاً ایک مفسر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قول **لَا يَظْلِمُونَ**

قَلْبِي کی تفسیر میں لکھا ہے کہ قلبی ان کے ایک دوست تھے۔ یا کَطْبِي السَّجِلَ لِلْكُتُبِ کی تفسیر میں بعضوں نے کہا ہے کہ کَلْبِ اسحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتب کا نام تھا۔ حالانکہ تمام ائمہ حدیث و تاریخ متفق ہیں کہ اس نام کا کوئی صحابی نہیں ہے۔ یا مَوْجَزَ الْجَزِينِ کی تفسیر علی و فاطمہ اور لولو و المرجان کی تفسیر حسین رضی اللہ عنہم یا الصَّبَا بَرِّينَ وَالصَّبَا دِقِينِ وَالْقَانِتَيْنِ وَالْمُنَافِقَيْنِ وَالْمُسْتَخْفِرَيْنِ کی تفسیر میں صابر سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق سے صدیق، قانت غرناؤق، منافقین سے عثمان غنیؓ، اور مستغفرین سے حضرت علی رضی اللہ عنہم، غرض اسی طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جو ان حضرات نے نسخ کی ہیں۔

(۴) — یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ چنانچہ بہت سی محکم اور یقینی آیتوں پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے نسخ اور منسوخ پر کتابیں لکھی ہیں ان کی نوکوشش یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیات منسوخ ہیں، غرض اس نسخ کے عقیدہ نے بھی تفسیروں کے اندر ایک عجیب پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ (۵) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے ہیں۔ مثلاً غَيْرِ الْمَضُوبِ عَلَيْهِ وَلَا الصَّبَالَيْنِ کی تفسیر میں دس قول ہیں۔ وَالْفَجْرَ وَلِيَالِ عَشْرِ کی متعدد تفسیریں ہیں۔ و شَاهِدٌ وَمَشْهُودٌ کی شرح میں کئی باتیں کہی گئی ہیں۔ اصحاب الاحدود کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا بحرانی باشندے تھے۔ الغرض سینکڑوں الفاظ و آیات ہیں جن کی کئی کئی تفسیریں یا، یا کر کے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جو ہم یقین کے ساتھ بیان نہیں کرتے، ان میں سے صحیح مفہوم کے فیصلہ کی قوت خود ان کے اندر مفقود ہوتی ہے۔ حالانکہ صحیح مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے آیات کی توضیح ہو، وہ اور مبہم ہو کے رہ جاتی ہے۔

(۶) — ان مفسروں کو قرآنی حقائق کی جستجو کم اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں کی تلاش زیادہ رہتی ہے۔ جنت کا ذکر ہے تو اس کے پیالوں اور آنچوروں کی تعداد کا شمار اور کوڑ اور طوبیٰ کی پیمائش کریں گے، دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور ساپنوں اور بچھوؤں کی درازی ناپیں گے، جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کے بجائے ان کے چہروں، گھوڑوں اور عماموں کے رنگ اور ان کی سواری و حملہ و قتال کی کیفیت لکھیں گے۔ یا جوج ماجوج کے تاریخی حالات بیان نہیں کریں بلکہ کوئی لکھے گا کہ ان کے قد اس درخت کے مشابہ ہیں، جو ٹمک شام میں نظر آتا ہے اور جس کی بلندی ایک سو بیس گز ہوتی ہے اور کوئی لکھے گا کہ ان کا ایک کان اور دُعا ہے اور دوسرا بچھونا۔ اگر ان چیزوں کو موقع نہیں پائیں گے تو فصاحت و بلاغت کی لطافتیں دکھلانے لگیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثوں میں الجھ جائیں گے۔ علم فطرت فعل الہی ہے، کتاب مبین علم الہی ہے اور قرآن کریم قول الہی ہے اور یہ تینوں متحد ہیں۔

جس طرح صحیفہ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے۔ اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور انسانی نسلیں ابدالاً و تنک بھی ان کو ختم نہیں کر سکتیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن بنی نوع انسان کی ہدایت کا انصاب مقرر کیا گیا ہے۔ مزید توضیح کیلئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریاوت شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے، مثلاً زمین، دریا، اور پہاڑ اور جنگل کو دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑ میں کوئی بُت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کوئی گاڑی نظر آئے تو ہر شخص بلا کسی اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔

درخت پر سے گرا ہوا پتہ، گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکہ، چینی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں اور بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال اگر سارے عالم کے ماہر اور کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسان کے کلام میں ہے۔

قُلْ لِّئِنْ أَجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُوا بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا (۱۸)

کہہ دے کہ اگر سارے جن و انس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ وہ سب ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق جو نیک عقلی چیزیں ہیں اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور یہی امتیاز قرآن کا وہ زندہ معجزہ ہے جو ہوا و دانی ہے اور اہل بصیرت پر سورج کی طرح نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیات الہی کا اقرار انسانی کے سامنے موازنہ کر کے اس کے اعجاز و دکھانے کی کوشش کی ہے اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس بے بصیری میں مبتلا تھے۔

دوسرا فرق مصنوعات فطرت اور مصنوعات انسانی میں یہ ہے کہ فطرتی اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی حد نہیں معین کی جاسکتی۔ بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اس قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے جو ایک معین اور مخصوص غرض و غایت کے لئے بنائی جاتی ہیں اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جس کو پہلے سے مد نظر رکھ کر وہ بنائی گئی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے وہ کسی ایک ماحول، ایک زمان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر محل ہر زمان اور ہر مکان کے لئے ہے۔ حقائق فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم بڑھتا جائے گا، اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائیں گے اور قرآن بھی فطرتی اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھک جانے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں اور ان کی غرض معین۔

اب ہم خود قرآن کریم ہی سے فہم قرآن کے وہ اصول بیان کرتے ہیں جو ہم نے اس سے افد کئے ہیں، کیونکہ قرآن جیسا کہ ہم سمجھ چکے ہیں جو اپنی کسی بات میں بھی دوسری کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

إِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۱۹)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف آتا رہے اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

(۱) قرآن فیہی کا اصل الاصول یہ ہے کہ اس کی بیان کی ہوئی جس حقیقت کی تفصیل مطلوب ہو وہ قرآن ہی سے نکالی جائے۔ کیونکہ قرآن کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

شَوْءَانِ عَلَيْنَا بَيَانُهُ (۲۰)

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

قرآن نے تصریح کر دی ہے کہ آیات قرآنی بیشتر محکمات ہیں یعنی ان کے معانی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں۔ جن کے حقائق انسان کی علمی و فطری وسعت سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات، صفات، جنّت، دوزخ اور میزان عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔ ان کے اوپر صرف ایمان کا مطالبہ ہے نہ کہ عمل کا۔ اس وجہ سے ان کی تفصیل مطلوب نہیں ہے۔ البتہ محکم آیات جو ائمہ کتاب اور اہل قرآن کہی گئی ہیں۔ ان کی تفصیلات اللہ ہی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ شَوْءَانِ عَلَيْنَا بَيَانُهُ (۲۱)

(ترجمہ) یہ (مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں حکم بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَا هُوَ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَا لَهُ عَلَىٰ عِلْمٍ ۖ هٗٓ۔ ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے جس کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی۔ یہ تفصیل اہل علم و فہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۖ۔ ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں۔ قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ ۖ۔ ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔ جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اسی قدر وہ قرآنی تفصیلات سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر فہم معانی میں اختلاف واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے جس طرح کہ امور فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخر کار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الحیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر تبدیلی الفاظ و عبارات و جملات پر مشتمل ہیں ان کی تشریح مضمحل ہے۔ وَكَذَٰلِكَ نَصْرَفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا ۖ اٰۤیٰتُ الْكِتٰبِ لَا تَحْكُمُ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ اَلَا بِمَا شِئْتَ وَقَدْ خَلَقْتَ فَطْرَ الْاٰنْسَانِ ۚ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اور اسی طرح ہم آیتوں کو پھیر پھیر کے لاتے ہیں تاکہ وہ کہیں کہ دَرَسْتَ وَلِنَبَيِّنَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۖ۔ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور ہم اہل علم کے لئے تشریح کر دیں۔

(الغرض قرآن کریم کی تفصیل خود قرآن ہی میں ہے اور وہ مفصل کتاب ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۖ) اور وہی ہے اللہ جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

اس لئے تفسیر قرآنی کی صورت یہ ہے کہ جس طرح حقائق فطرت کے مفکرین اپنی علمی تحقیق کے لئے ایک خاص شعبہ کو جس میں ان کو مہارت ہوتی ہے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ جو علوم صحیحہ میں سے کسی علم کے ماہر ہوں قرآن کی ان مخصوص آیات کی تفصیل جو ان کے علم سے تعلق رکھتی ہیں اپنے ذہن میں اور ان پر علم و بصیرت کے ساتھ غور و فکر کریں۔ اس طرح قرآن کریم کی تفصیل ہوتی جائے گی اور عالم فطرت کی طرح اس کے حقائق بھی آشکارا ہوتے جائیں گے۔ لیکن علم کے ساتھ اخلاص بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر قرآن سمجھیں نہیں آتا۔ بے شک قرآن سے نصیحت لینا اور اس پر عمل کرنا علوم کے لئے بھی اہل ہے جس طرح کہ عالم فطرت کی نعمتوں سے مستمتع ہونا جانوروں کے لئے بھی آسان ہے مگر عالم فطرت پر غور کرنے والوں نے ہزار ہا چیزیں جو ایجاد کی ہیں وہ ان کے فہم سے بالاتر ہیں۔ اسی طرح قرآنی حکمت تک رسائی علوم صحیحہ کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے۔

اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ قرآن کی موجودہ تفسیریں جو آج تک ہوئی ہیں ان سے آیات کے معانی حل ہونے میں اور یہ ضروری اور ابتدائی چیز ہے لیکن کسی قرآنی حقیقت کی توضیح کے لئے سارے قرآن کو چھاننا پڑے گا۔ اور اس لحاظ سے ابھی تک قرآن پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔

۲۔ آیات کی تشریح میں روایات سے مدد لی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ روایات سنداً غام ہوتی ہیں اس لئے ان پر تفسیر کا مدار نہیں رکھا جاسکتا۔ تاریخ تفسیر میں ہم امام احمد بن حنبلؒ کا قول نقل کر چکے ہیں کہ تفسیری روایتیں بوجہ ضعف رواۃ کے بے اصل ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ صحاح ستہ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں لیکن ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ ابھی امام موصوف کے قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے الفاظ جس حد تک لے چلیں اس سے ان کے مطلق قدم نہ بڑھایا جائے کیونکہ قرآن کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اپنے معنی کے لحاظ سے کامل اور مقصود کے مطابق ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ط اور تیرے رب کے الفاظ سچائی اور (معنی کی) برابری کے لحاظ سے پورے ہیں۔

ان کلمات سے آگے بڑھنے میں قرآنی حدود سے تجاوز لازمی ہے جو بڑی غلطیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ مثلاً: —

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يُحْشِرُهُمْ (۲۵-۲۶) | ہم کو تم میں سے آگے جانے والوں کا بھی علم ہے اور پیچھے آنے والوں کا بھی علم ہے۔ بیشک تیرا رب ان کو حشر میں جمع کرے گا۔

مستقدم اور مستأخر کے الفاظ قرآن میں کئی جگہ پہلے اور پیچھے کرنے والوں کے لئے مستعمل ہوئے ہیں۔ مثلاً: —

إِذَا جَاءَ أَجْلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (۹۱) | جب ان کی اجل آجائے گی تو ایک گھڑی نہ وہ پیچھے رہیں گے، نہ آگے بڑھیں گے۔

یعنی اپنے وقت معینہ پر ان کی ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ اس لئے قرآن کی تفصیل کے مطابق ”وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ“ کے معنی یہ ہوئے کہ تم میں سے جو لوگ پہلے گزر گئے اور جو بعد میں مرے گئے ان سب کا ہم علم رکھتے ہیں اور حشر کے دن ان سب کو جمع کریں گے لیکن بعضوں نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ ایک حسین عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز جماعت پڑھنے کے لئے مسجد میں آیا کرتی تھی کچھ لوگ آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں اور کچھ پیچھے کی صف میں رہ جاتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل میں سے اس کی طرف جھانکتے تھے انہیں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

اب یہ معنی نکالنے کے لئے آیت میں پہلی صف اور پچھلی صف کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑتا ہے جو اصولاً جائز نہیں۔ پھر صحابہ کرام کی ایک جماعت پر ایسا مکروہ الزام عائد ہوتا ہے جس کو کوئی شخص جو ان کے حالات سے واقف ہے تسلیم نہیں کر سکتا۔ اگرچہ یہ روایت صحاح ستہ کی تین کتابوں میں درج ہیں لیکن خود قرآنی تفصیل کی مخالف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔

۵ — جہاں تک زبان کا تعلق ہے قرآن کی عربی آسان اور واضح ہے جس میں کوئی پیچیدگی نہیں، —

بَلِسَانَ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ - (۱۹۵) — واضح عربی زبان میں —

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ - (۲۹) | عربی قرآن جس میں کوئی کجی نہیں —

فَاتِمَاتُ يَسْتَرْنَ لَا بَلِيسَانِكَ (۲۸) | ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے۔

لہذا، قرآن کے معنی وہی لئے جائیں گے جو عربی زبان کے مطابق صحیح ہوں۔ اہل لغت نے جو معانی الفاظ کے لکھے ہیں ان کی بنیاد سناٹ پر ہے۔ قرآنی الفاظ کے معانی میں اگر اختلاف واقع ہو تو خود قرآن سے ان کا تعین ہو سکتا ہے۔

اصول و قواعد لسانی کی ترتیب بھی نزول قرآن کے مدتوں بعد ہوئی ہے۔ بلکہ ان کا بڑا حصہ ائمہ فن نے خود قرآن ہی سے استنباط کیا ہے۔ لہذا، یہ اصول قرآن پر قائم نہیں ہو سکتے، اگر کوئی بات قرآن میں اصول کے خلاف ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ جن لوگوں نے اصول استنباط کئے ان سے کمی رہ گئی ہے۔

۶ — ایک اہم اصول قرآن فہمی کا یہ ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے: —

وَكُوكَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوْ جَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا - (۸۲) | اور اگر یہ قرآن اللہ کے ہوا کسی غیر کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

اس لئے کسی آیت کی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو دوسری آیت کے خلاف پڑتی ہو: مثلاً: —

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْصُرُهُمْ وَلا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شَفَعَاءُنَا عِنْدَ اللَّهِ ط

قُلْ أَتَنْبِئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ط (۱۸)

عام مفسروں نے آیت بالا میں لَا يَعْلَمُ کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے۔ یعنی اللہ کی طرف لاعلمی منسوب کی ہے۔ شاہ عبد القادر نے بھی اس کا ترجمہ یہ کیا ہے: —

”اور پوچھتے ہیں اللہ کے نیچے جو چیز نہ بُرا کرے ان کا نہ بھلا کرے اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس تو کبہ کو تم اللہ کو جانتے ہو، جو اس کو معلوم نہیں کہیں آسمانوں میں نہ زمینوں میں“ —

یہ تفسیر یا ترجمہ علاوہ اس کے کہ جبارت ہے جو کسی مسلمان کے لئے زیبا نہیں براہ راست خود قرآنی تصریح کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ہے: —

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ | جس شے کو بھی وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں اللہ اس کو جانتا ہے۔ پھر یہ مشرکین اللہ کو اپنے باطل معبودوں کی خبر ہرگز نہیں دیتے بلکہ ان کے توسط سے خود اپنی حاجتوں کی خبر اللہ تک پہنچاتا ہے اور یہی معنی سفارشی بنائے گئے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اللہ کو اپنے معبودوں کی خبر دیتے تو خود اپنا حال بھی اس سے کہہ سکتے ہیں۔ بیچ میں سفارشی کیا ضرورت تھی۔ اس آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے: —

”اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہہ دے کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے“ — پہلے یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں نسخ کے عقیدہ نے بہت غریباں پیدا کی ہیں۔ مفسرین تین قسم کی نسخ کے قائل ہیں (۱) وہ آیات جن کا حکم بھی منسوخ ہو گیا اور وہ بڑھی لکھی بھی نہیں جاتیں —

یہ خیال چند نہایت ضعیف بلکہ موضوع روایات سے پیدا ہوا۔ جن کو اکثر ائمہ حدیث خاص کر قاضی ابوبکر نے موضوعات کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ اب چونکہ وہ آیتیں موجود نہیں نہ ان کے احکام باقی ہیں۔ اس لئے ان پر بحث بھی غیر ضروری ہے — (۲) وہ آیات جن کا حکم نہیں منسوخ ہوا، تلاوت منسوخ ہو گئی —

نسخ کی یہ قسم عقل کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اگر حقیقت میں کوئی ایسی آیت ہوتی تو ناممکن تھا کہ اللہ اس کی حفاظت نہ کرتا۔ مثال میں آیت رجم پیش کی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر واقعی آیت رجم نازل ہوئی ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن میں درج ہونے سے رہ جاتی۔ خود حضرت عسکریؑ جن سے یہ روایت کی گئی ہے جمع قرآن میں شریک تھے۔ کیا چیز نالج تھی کہ انہوں نے اس کو نہ لکھوایا۔ علاوہ بریں چونکہ یہ روایت قرآن کی تصریح اِذَا لَمْ يَحْضُرُوا فَظُوفُ کے خلاف ہے۔ اس لئے ہرگز تسلیم کے قابل نہیں خواہ اس کے راوی جبریل و میکائیل ہی کیوں نہ بتانے جائیں —

(۳) وہ آیات جن کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ مگر تلاوت منسوخ نہیں ہوئی —

اس قسم سوم میں لوگوں نے اسے قیاس کو اس قدر دخل دیا کہ پچاسوں آیتوں پر نسخ کا حکم لگا دیا۔ علامہ ابن العربی نے اس تعداد کو کم کر کے ۲۱ آیتوں کو منسوخ قرار دیا شاہ ولی اللہ صاحب نے ان میں ذرا اور غور کیا تو ان کے نزدیک صرف پانچ آیتیں منسوخ ثابت ہوئیں۔ ہمارے نزدیک وہ بھی منسوخ نہیں۔

یہ صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آیات کو جن لوگوں نے منسوخ کہا ہے محض اپنی رائے اور قیاس سے کہا ہے۔ اور اللہ کا کلام اس سے کہیں بالاتر ہے کہ وہ کسی انسان کی رائے سے منسوخ ہو سکے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ قرآن کے ایک

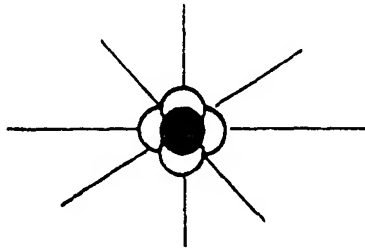
لفظ کو بھی بدل سکیں —

مِنْ تِلْكَ آيَاتِ فَتْنِي | کہہ دے کہ مجھے حق نہیں ہے کہ اس کو بدلوں اپنی طرف سے۔

اُن آیات کے متعلق جن کو لوگوں نے منسوخ الحکم قرار دیا ہے ہم کو یقین ہے کہ وہ قرآن کی احکامی آیتیں ہیں۔ اللہ نے ان کو نازل فرمایا ہے اور رسول نے ان کو یاد کرایا اور قرآن میں لکھوایا ہے۔ اب سوال اللہ کے دوسرے لوگوں ان کو منسوخ کر سکتا ہے، اگر کسی کو دو آیتوں میں باہمی تعارض نظر آتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک کو منسوخ قرار دیتا ہے تو یہ اس کی فہم کا قصور ہے کیونکہ قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے۔ قرآن کی آیات میں سے ایک بھی منسوخ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے روایات سے آیات کو منسوخ قرار دیا ہے انہوں نے قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے مثلاً: —

كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲۴۱)

صریح الفاظ میں اللہ نے مالداروں پر ورثہ کے لئے وصیت فرض کی اور متقیوں پر اس کو لازمی قرار دے کر مؤكد فرمایا۔ پھر آیت وراثت میں بھی تین جگہ "مِنْ بَعْدِ وَصِيَّتِهِ" فرما کر توضیح کر دی اور تواریث کا اجراء وصیت کے نفاذ کے بعد ہوگا۔ مگر فقہانے "الْأَوْلَادُ" اور "الْوَصِيَّةُ" کو وارث کے لئے وصیت نہیں ہے کی روایت سے اس مؤكد آیت کو منسوخ کر ڈالا اور یہ سمجھنے کے کہ وصیت ورثہ کی شخصی مصلحتوں کے لیے ہے۔ جو تواریث میں ممکن نہیں۔ کیونکہ ورثہ کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ فرض کر دے کہ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں جن میں سے ایک پر اس نے ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اور اس کو پرہا لکھا کہ اس قابل بنا دیا ہے، کہ وہ خوب کما تا ہے اور باپ کی دولت سے مستغنی ہے۔ دوسرا بیٹا آج پیدا ہوا ہے۔ وراثت کا قانون کلی ہے وہ شخصی مصالح کا لحاظ نہیں کرے گا اور دونوں کو برابر دے گا۔ لیکن مصالح عائلی کا تقاضا اس کے خلاف ہے۔ اس قسم کے مخصوص حالات کے لئے وصیت فرض کی گئی ہے تاکہ مورث اپنے ورثہ کی مناسب ضرورتوں کا لحاظ رکھ سکے۔ ایسی ضروری اور مؤكد آیت کو لوگوں نے صرف خبر احادی کی بنا پر منسوخ کر ڈالا اور قرآن کی لکھائی ہوئی مصلحت کو ضائع کر دیا۔



۱۰ اس مضمون کو جس صاحبِ علم نے مرتب کیا تھا۔ ہم نے اُس کی زائد اور غیر موزوں باتوں کو حذف کر دیا ہے۔

قرآن کی تفہیم اور تفسیر اصول

علامہ رشید رضا جو مصر کے ایک محقق مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر "المنار" کافی شہرت کی حامل ہے انہوں نے اپنی تفسیر کے مقدمے میں تفسیر اور قرآن فہمی کے چند اصول لکھے ہیں: —

"تفسیر قرآن میں کلام کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بلکہ بسا اوقات وہ مشکل ترین اور اہم امور میں سے ہو جاتا لیکن ہر مشکل کو چھوڑا نہیں جاتا۔ اس لیے لوگوں کو اس کی طلب سے رکنا نہ چاہیے۔ —

تفسیر قرآن کے دشوار ہونے کی کئی وجوہ ہیں جن میں سے اہم یہ ہے، کہ قرآن آسمانی کتاب ہے، جو بارگاہ ربوبیت سے جس کی کنتہ تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی، اہل انبیائے کتب پر نازل ہوا ہے، اور جو معارف عالیہ اور بلند مقاصد پر مشتمل ہے، جن پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا، سب قرآن کے جن کے نفوس پاک ہیں اور جن کی عقلیں سلیم ہیں اور یہ کہ اس کا طالب اپنے سامنے وہ ہیبت و جلال دیکھتا ہے جو بارگاہ کمال سے اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کی عقل حیران، ششدر ہو کر رہ جاتی ہے اور بہت ممکن ہے، کہ اس کے اور مطلوب کے درمیان وہ حائل ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر معاملہ کو اس طرح آسان کر دیا، کہ ہمیں فہم و عقل سے کام لینے کا حکم دیا، کیونکہ یہ کتاب نور و ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے جو لوگوں کے لئے شریعتیں اور احکام الہی بیان کرتی ہے اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ہم اسے نہ سمجھیں۔ —

اور تفسیر جس کے ہم طالب ہیں، وہ دراصل کتاب اللہ کو اس حیثیت سے سمجھنا ہے کہ وہ دین ہے جو لوگوں کو اس بات کی ہدایت کرتا ہے، کہ دنیوی اور اخروی زندگی میں ان کی سعادت کس امر سے وابستہ ہے اور یہی اس کا اہل مقصد ہے اور اس کے سوا جو سمجھیں ہیں وہ اس کی تابع اور اس کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ —

پھر فرماتے ہیں کہ تفسیر کے کئی زاویہ نگاہ ہوتے ہیں مثلاً: —

۱۔ — کتاب کے اسلوب اور اس کے معانی میں فکر و نظر اور یہ کہ بلاغت کے انواع میں سے وہ کس پر مشتمل ہے تاکہ اس سے کلام کی بلندی اور قول کے لحاظ سے کلام غیر سے امتیاز کی معرفت حاصل ہو۔ زمر مختصری نے یہی راہ اختیار کی ہے اور کچھ دوسرے مقام بھی سامنے رکھے ہیں اور زمر مختصری کے علاوہ کچھ اور لوگوں نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے

۲۔ — وجوہ اعراب کے نقطہ نظر سے تفسیر، اس کی طرف بھی کچھ لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور وجوہ اعراب کے بیان کرنے میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے، نیز یہ امر بھی پھیلا کر بیان کیا ہے کہ الفاظ کس کس معنی اور کن وجوہ کے مشتمل ہیں۔ —

۳۔ — قصص کا بیان کرنا۔ یہ روش بھی کچھ لوگوں نے اختیار کی ہے۔ اور قرآنی قصص میں جو چاہا مکتب تاریخ اور اسرائیلیات سے اخذ کر کے بڑھا دیا اور صرف تورات و انجیل ہی پر اعتماد نہیں کیا اور نہ ان کتابوں پر اکتفا کی جو اہل کتاب کے نزدیک معتد ہیں، بلکہ انہوں نے لوگوں سے جو کچھ سنا، سب لے لیا، اس بات کی تفریق کے بغیر کہ قوی کون سی بات ہے۔

اور ضعیف کون سی ہے اور نہ اس بات کی تفتیح کی کہ وہ خلاف شریعت بھی ہے اور خلاف عقل بھی —
۴ — قرآن کے غریب الفاظ کی تشریح و توضیح —

۵ — عبادات و معاملات سے متعلق شرعی احکام اور ان کا استنباط کرنا اور بعض لوگوں نے تو یہ کیا کہ احکام کی آیات کو جمع کر کے صرف انہی کی تفسیر کی، جن میں سے ایک ابوبکر بن عمری ہیں۔ اور جن مفسرین پر فقہ کا غلبہ ہے وہ ان آیات کی تفسیر کی طرف، جو عبادات و معاملات کے احکام سے متعلق ہیں، دوسری آیات کی طرف توجہ کرنے سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔
۶ — اصول عقائد سے متعلق بحث اور کجی اختیار کرنے والوں کو سیدھا کرنا اور اختلاف کرنے والوں سے بحث کرنا۔
امام رازی نے اس طرز تفسیر پر زیادہ توجہ دی ہے —

۷ — وعظ و نصیحت اور سوز و گداز پیدا کرنے والی باتیں بیان کرنا جن لوگوں کو ان باتوں سے شغف ہے، انہوں نے تفسیر میں صوفیاء اور عابدین کی حکایتیں شامل کر دیں، اور بعض لوگ تو ایسے ہیں جو حکایات و قصص کے بیان کرنے میں فضائل و آداب کے ان حدود سے تجاوز کر گئے جن کو قرآن نے مقرر کیا ہے —

۸ — تفسیر میں وہ چیزیں بیان کرنا جنہیں ”اشارہ“ کہا جاتا ہے اور اس معاملہ میں لوگوں کو باطنیہ کے اور صوفیہ کے کلام میں التباس ہو گیا ہے، اور اسی قسم میں وہ تفسیر ہے جو شیخ اکبر عی الدین بن عمری کی طرف منسوب ہے، حالانکہ وہ مشہور باطنی فاشانی (کاشانی) کی تفسیر ہے اور اس میں ایسی لغویات ہیں جن سے اللہ کا دین اور اس کی کتاب عزیز بری ہے —

میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان مقاصد میں سے کسی خاص مقصد کی طرف بہت زیادہ جھکاؤ اکثر لوگوں کو کتاب الہی کے مقصودِ اصلی سے دور کر کے ایسی وادیوں میں لے جاتا ہے، کہ وہ اس کے حقیقی معنی فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ اسی تفسیر سے ہم جو مراد لیتے ہیں، وہ وہی ہے جس کا ذکر پہلے آچکا، یعنی یہ کہ کتاب کو اس حیثیت سے سمجھنا کہ یہ دین ہے اور اللہ کی طرف سے تمام دنیا والوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور دنیا و آخرت کی سعادتوں کی جامع ہے۔ یعنی اس میں ان باتوں کا بھی بیان ہے۔ جن لوگوں کے معاملات اس دنیا کی زندگی میں درست رہتے ہیں اور ان باتوں کا بھی بیان ہے جن کی وجہ سے وہ آخرت میں بھی نیک بخت ہوں گے۔

ہاں بلاشبہ اس کے ساتھ وجہ بلاغت کا بھی اس حد تک بیان کرنا ضروری ہے، جس حد تک معنی اس کی برداشت کر سکے، اور اعراب کی تحقیق بھی ہونی چاہئے، مگر اس حد تک جو فصاحت قرآن اور اس کی بلاغت کے لائق ہو، یعنی جس وقت اس کی حاجت ہو، جیسے وہ متعلق مسائل جن کا بیان کرنا ناگزیر ہو، اور ہم بسا اوقات اعراب کی طرف بغیر کسی نحوی اصطلاحی عبارت کی تصریح کے اشارہ کریں گے جیسا کہ بلاغت کے بعض نکتوں میں یا اصول کے قواعد میں یہ طریق اختیار کیا ہے، تاکہ قاری اصطلاحات کے پکڑ میں پھنس کر اصل معانی و مقاصد سے دور نہ ہو جائے اور یہ اصطلاحات اُسے عبرت و نصیحت حاصل کرنے میں مانع نہ ہوں —

ممکن ہے کہ موجودہ زمانے کے بعض لوگ یہ کہنے لگیں کہ ہمیں نہ تفسیر کی حاجت ہے، اور نہ قرآن میں تدبر کرنے کی، اس لیے کہ ائمہ سابقین نے کتاب و سنت میں غور و فکر کا حق ادا کر دیا اور ان سے احکام کا استنباط کر لیا، لہذا ہم کو تدبر فی القرآن سے مستغنی کر دیا ہے۔ لیکن اگر یہ خیال صحیح ہے تو پھر تفسیر کی طلب ایک فعل غیث ٹھہرتی ہے اور اس میں سوائے توضیح اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں، حالانکہ — اگرچہ اس خیال میں شانِ فقہ کی تعظیم کا ایک

پہلو ہے مگر۔۔۔۔۔ یہ اجماع اُمت کے خلاف ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک کے ہر مومن کے موقف کی مخالفت اور میں نہیں جانتا کہ یہ بات کسی مسلم کے دل میں کیسے آسکتی ہے۔۔۔۔۔

وہ احکام عملیہ جن کے لیے اصطلاحی اسماء استعمال کئے جاتے ہیں، وہ اس قبیل سے ہیں، جو قرآن میں بہت کم آئے ہیں۔ اس میں تو تہذیب اخلاق کا درس ہے روحوں کو اس بات کی طرف دعوت ہے جس میں ان کی سعادت ہے، اور ایسی تعلیمات ہیں، جو جہالت کی پستی سے نکال کر اوج معرفت پر فائز کرتی ہیں، اور حیات اجتماعیہ کے طریقہ کی طرف رہنمائی ہے، جس سے وہ شخص جو اللہ پر ادرتیا میت پر ایمان رکھتا ہے، کبھی کسی حال میں شغنی نہیں ہو سکتا اور جو تحقیقی فرقہ میں داخل ہونے کی زیادہ مستحق ہے۔ اور اس قسم کی رہنمائی بجز قرآن کے اور کسی جگہ نہ ملے گی یا پھر وہ کتب ہیں جن میں ان باتوں کو قرآن سے لیا گیا ہے، مثلاً احیاء العلوم، کہ اس میں علم تہذیب کافی حصہ ہے۔ لیکن قرآن کی شوکت ان نفوس پر جو اسے سمجھنے ہیں اور اس کی تاثیر ان لوگوں کے دلوں میں جو اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں کوئی کلام نہیں آسکتا، جیسا کہ اس کی بہت سی حکمتوں اور معارف کا انکشاف اب تک نہیں ہو سکا ہے اور کسی عالم و امام نے ان کو ظاہر نہیں کیا ہے۔ پھر یہ کہ ائمہ دین نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن افراد بشر میں سے ہر فرد پر قیامت تک کے لیے حجت ہے، اور اس کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ حدیث ہے "والقرآن حجة لک وعلیک" اور ظاہر ہے، کہ یہ سمجھنے بغیر عقل کی گرفت میں نہیں آسکتا اور اس کی حکمتوں اور بصائر کو صحیح طور پر سمجھنے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان لوگوں سے خطاب کیا ہے، جو زمانہ نزول قرآن کے وقت تھے، اور ان سے خطاب کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان اشخاص میں کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس لئے کہ وہ اس نوع انسانی کے افراد تھے، جس کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ کا قول ہے کہ یا ایہذا الناس اتقوا ربکم۔ تو کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ اللہ ہمارے اس طرز عمل کو پسند فرمائے گا کہ ہم اللہ کے قول کو نہ سمجھیں، اور قرآن میں فکرو نظر کرنے والے کسی ایسے شخص کے قول پر انکشاف کر کے بیٹھ رہیں، جس کی اتباع کے لازم ہونے کی بابت ہمارے پاس کوئی دجی نہیں آتی ہے، نہ تجللاً اور نہ تفصیلاً نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ ہر شخص پر واجب ہے، کہ وہ اپنی بساط کے مطابق حتیٰ الوسع کتاب اللہ کی آیات کو اچھی طرح سمجھے، اس میں عالم و جاہل کا کوئی فرق نہیں ہے۔ عامی انسان کے لئے تو اللہ تعالیٰ کے اس قول میں۔۔۔۔۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِینَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ۔۔۔۔۔ جو کچھ ظاہر آیات سے معلوم ہو، اسی کا سمجھنا کافی ہے، اور یہ کہ ایسے لوگ جو آیات کریمہ میں بیان کردہ اوصاف سے آراستہ ہیں، انہی کے لیے فوز و فلاح ہے،

۱۔ قرآن تیرے لیے یا تجھ پر حجت ہے۔۔۔۔۔

۲۔ مطلب یہ کہ قرآن ہدایت ہے رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لئے اور نزول قرآن کے وقت کے افراد اس کے مخاطب اول تھے۔۔۔۔۔ (مترجم)

۳۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو (۲/۲۰۱)۔ (اس میں انسان قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے)

۴۔ وہ مومنین فلاح یافتہ ہوئے جو اپنی نمازیں خشوع کرتے ہیں۔۔۔۔۔ (المومنون - ۲۰۱)

غرض، جو شخص قرآن کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتا ہے، اُسے چاہئے کہ مکت میں جو اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئی ہیں، ان سے واقفیت حاصل کرے، تاکہ وہ ان میں اور کتاب میں جس معنی کی رو سے وہ لفظ وارد ہوا ہے فرق کر سکے، کیونکہ اکثر مفسرین نے کلمات قرآن کی تفسیر ان اصطلاحات سے کی ہے جو مکت میں تیسری صدی ہجری کے لگ بھگ کی پیداواریں لہذا قرآنی الفاظ کی تفسیر ان معانی کے مطابق کی جانی چاہئے جو زمانہ نزول قرآن میں مستعمل تھے اور بہتر تو یہ ہے کہ ہم لفظ محض قرآن سے سمجھیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے مختلف مقامات میں ایک لفظ کی جو تکرار کی گئی ہے ان سب کو یک جا کر لیں اور پھر غور کریں، ایسا کرنے پر تم دیکھو گے کہ لفظ بسا اوقات مختلف معانی کے لئے استعمال کیا گیا ہوگا۔ مثلاً لفظ "ہدایت" وغیرہ اور تحقیق کی جائے کہ لفظ کا کون سا معنی کس طرح زیر غور آیت کے مدعا و مفاد سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے، اس طرح لفظ کے مختلف معانی کے درمیان سے از خود معنی مطلوب ابھر کر سامنے آجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے اور اس طرح عمل کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی لئے لفظ کے معنی کی حقیقت پر دلالت کرنے والا بہترین قرینہ لفظ کا سابق قول کے ساتھ موافق ہو جانا ہے، اور جملہ کے معنی کے ساتھ جو معنی پوری طرح مناسب ہو جائے اور اس مقصد کے ساتھ جڑ جائے جس کے لئے کتاب میں وہ جملہ آیا ہے۔ تو سمجھ لو کہ اس جگہ لفظ کے مختلف معانی میں سے وہی معنی مطلوب ہے۔

(۲) **فہم اسالیب** اس کے لئے چاہئے کہ مفسر کو وہ علم حاصل ہو جس سے وہ ان بُند اسالیب کو سمجھ سکے اور یہ کلامِ بلیغ کی مشق اور اس کے نکات و محاسن کو سمجھنے کے ساتھ اس کی مزا و لذت اور شکم کی مراد سے

واقفیت بہم پہنچانے کی جانب توجہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہاں، یہ صحیح ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی مراد تک تمام و کمال طریقہ پر پہنچنے کی عزت حاصل نہیں کر سکتے، لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس کی ہدایت ہمیں مل رہی ہو اور اس بارے میں علمِ اسرار اور علمِ اسالیب کی ضرورت ہوتی ہے جس کا نام "علم معانی و بیان" ہے۔ لیکن ان فنون کا صرف جان لینا اور ان کے مسائل کو سمجھ لینا اور اس کے احکام کا یاد کر لینا مطلوب کے لئے مفید نہیں ہے (بلکہ مشق و مزا و لذت ضروری ہے) —

تم مکتب عربیہ میں دیکھو گے کہ عرب کی زبان آوری کے سامنے غیر عرب کی زبانیں گنگ ہو جاتی تھیں اور عرب قواعد کے بالکل مطابق گفتگو کیا کرتے تھے، حالانکہ اُس وقت تک قواعد سازی ہوئی بھی نہ تھی، پھر کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ صفت اُن کی خلقی و طبعی تھی نہیں، بلکہ وہ تو ان کا ملکہِ راسخ تھا، جو سننے اور بات چیت کرنے سے حاصل ہوتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ جب اولادِ عرب عجمیوں کے ساتھ ملنے جلنے اور اُٹھنے بیٹھنے لگی تو وہ عجمیوں سے بھی زیادہ گونگے ہو گئے، پس اگر یہ بات اُن کی ذاتی اور طبعی ہوتی تو ہجری سال کے لحاظ سے صرف پچاس سال میں کشتہ کی مدت میں وہ اسے کھوند دیتے۔

(۳) **انسان کی مختلف حالتوں کا علم** کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل فرمائی، جو آخری کتاب الہی ہے اور اس میں ان باتوں کو ظاہر کیا جن کو اس کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں بتایا تھا اس میں مخلوق کے احوال، ان کی طبیعتوں کے کوائف اور بشر کے معاملہ میں سننِ الہیہ کا بکثرت بیان ہے اور انتوں کے بہترین قصص اور ان کی وہ سیرتیں ہیں بتائی ہیں جو سنتِ الہی کے موافق ہیں، لہذا اس کتاب میں غور و فکر کرنے

والے کیلئے ضروری ہے کہ انسان کی حالتوں کو، اُن کے طور پر بقول کو، ان کے ادوار کو اچھی طرح سمجھے اور جانے اور ان کے حالات کے اختلاف کے قوی و ضعیف اسباب میں فکر و نظر کرے، نیز عزّت و ذلت، علم و جہالت اور ایمان و کفر کے لحاظ سے بھی انسانی احوال کے اختلاف اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو جانے اور ان امور کے ساتھ ساتھ عالم کبیر کے علوی و سفلی حالات کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اور ان امور کے لئے بہت سے فنون کے جاننے کی ضرورت ہے جن میں سے اہم تاریخ اور اس کے انواع و اقسام ہیں۔

استاذ امام (شیخ محمد عبدہ) فرماتے ہیں کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کسی کے لئے یہ کس طرح ممکن ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تفسیر کرے ————— کان الناس اُمَّةٌ واحدةٌ فبعث اللہ النبیین مبشرين ومنذرين... الخ۔ جب تک کہ وہ یہ نہ جانتا ہو کہ انسان کی حالتیں کیا تھیں اور وہ کس طرح متحد ہوئے اور پھر ان میں اختلاف و افتراق کس طرح ہوا اور جس وحدت پر وہ تھے اس کے کیا معنی ہیں، اور کیا وہ اتحاد ان کے لئے نافع تھا یا ضرر رساں اور پھر ان میں انبیاء کی بعثت کے کیا نتائج و آثار ہوئے۔

قرآن میں اللہ نے اُنہوں کے حالات اور اُسُن الہیہ اور آسمانوں اور زمین اور نفس و آفاق میں اپنی نشانیوں کو مختصر طور پر بیان کیا ہے، اور وہ ایسا اختصار و اجمال ہے، جو اس مہمتی کی جانب سے وارد ہوا ہے جو ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اس نے ہم کو فکر و نظر کا حکم دیا ہے اور دنیا میں سیاحت کرنے کی تاکید کی ہے تاکہ ہم اس کے اجمال کو تفصیل سے سمجھیں جو ہماری ترقی و کمال میں زیادتی کا باعث ہو۔ اور اگر ہم کائنات کے علم پر صرف سطحی اور ظاہری نظر سے کفایت کر لیں تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی کسی کتاب سے متعلق فیصلہ صرف اس کی جلد کا رنگ دیکھ کر کر ڈالے اور یہ نہ دیکھے کہ اس کے اندر علم و حکمت کی کون کون سی باتیں ہیں۔

۴۔ یہ علم کہ تمام انسانوں کی ہدایت قرآن سے کس طرح ہوگی۔ تو جو مفسر اس فرض کفایہ سے عہدہ برا ہونے کے لیے کھڑا ہوگا، اُسے یہ معلوم کرنا ضروری ہوگا کہ زمانہ نبوت میں عرب اور غیر عرب کے عقائد و مذاہب کیا تھے، بالخصوص اس لیے بھی کہ قرآن پوری صراحت سے اعلان کر رہا ہے، کہ سارے انسان شقاوت اور گمراہی میں مبتلا تھے اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ہدایت اور سعادت کی راہ پر انہیں چلانے کے لیے مبعوث کئے گئے، لہذا مفسر اگر ان کی حالتوں کو اور ان کے مذاہب کو نہ جانتا ہوگا تو کس طرح یہ بات معلوم کر سکے گا کہ آیات الہیہ نے ان کے کن نظریات و رجحانات اور خصائل و عادات کو حقیقتاً یا بالواسطہ مذموم قرار دیا ہے۔

۱۔ ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے انبیاء مبعوث کئے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے۔ (۲۱۳)

۲۔ مقدمہ کے آخر میں لکھا ہے، کہ استاذ امام رحمۃ اللہ (مفتی محمد عبدہ) نے اس آیت کی تفسیر میں وہ امور بیان کئے ہیں جو کسی کتاب میں نہیں پائے جاتے۔ اس آیت سے متعلق شیخ محمد عبدہ کے افادہ رسالہ ”النار“ کی جلد ۸ کے جزو ثانی میں یعنی ۳۲۳ھ کی جلد میں شائع ہوئے تھے (مُصنّف)

میرے اس موقف کی تائید حضرت عمرؓ کے ایک ارشاد سے بھی ہوتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ احوال جاہلیت سے لوگوں کا بے خبر رہنا ہی وہ چیز جس کی وجہ سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ اسلام کا لباس پارہ پارہ ہو جائے۔

مطلب یہ کہ جس نے اسلام میں نشوونما پائی اور اپنے پہلے کے لوگوں کی حالتوں کو نہیں جانا تو وہ ہدایتِ اسلام کی تاثیر سے ناکشنا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس غایت سے بے خبر ہو جاتا ہے کہ اس نے انسانوں کی حالتوں میں کیا اور کس طرح تغیر پیدا کیا اور ان کو کس طرح تاریکی سے روشنی کی طرف نکالا۔

۵۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے اصحاب کی سیرت کا علم اور یہ کہ ان کا علم و عمل کیا تھا اور وہ اپنے دنیوی اور اخروی معاملات سے کس طرح عہدہ برآ ہوا کرتے تھے۔ پس، مذکورہ بالا ان تمام باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ تفسیر کی دو قسمیں ہیں، ایک تو ہے بالکل خشک اور غیر مفید بلکہ اللہ سے اور اس کی کتاب سے دور کر دینے والی اور وہ یہ ہے، کہ مقصود صرف حل الفاظ اور جملوں کا اعراب ہو اور یہ کہ ان عبادات و ارشادات سے کیسے کچھ فنی نکات نکلتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس طرز کو تفسیر کہنا ہی غلط ہے، بلکہ یہ ایک قسم کا فنی مظاہرہ اور ایک طرح کی فنی مشق ہے، جیسے نحو اور معانی وغیرہ فنون میں مشق و تمرین کی جاتی ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس کی بابت ہم کہتے ہیں کہ فرض کفایہ ہونے کی حیثیت سے یہ لوگوں پر واجب ہے اور وہ یہ ہے کہ تفسیر کو مذکورہ بالا شرطوں کی جامع ہونا چاہیے، تاکہ ان کی غایت و غرض کے لئے ان کو استعمال کیا جائے، اور وہ اس طرح کہ مفسر مراد قول سمجھنے کے لئے پوری طرح کوشش کرے اور عقائد و احکام میں تشریح کی حکمت اس طرح سمجھے کہ رُوح کو پہنچ سکے اور ان کو عمل اور اس ہدایت پر گامزن کرے، جو کلام میں ودیعت کی ہوئی ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مدعا متحقق ہو جائے کہ قرآن ہدایت اور رحمت ہے (ہدئی و رحمتہ) پس ان شرائط و فنون کے پیچھے جو مقصد کار فرما ہونا چاہیے وہ قرآن سے ہدایت پانا ہے۔

استاذ اہم (مفتی محمد عبدہ) نے فرمایا کہ یہی وہ پہلی غرض اور مدعا ہے اصلی ہے جس کو میں تفسیر کے پڑھنے میں پیش نظر رکھتا ہوں۔

اس اہم مقدمہ کو انہوں (علامہ رشید رضا) نے اپنے اس قول پر ختم کیا ہے کہ:۔

۱۵۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دعویٰ اس وقت درست ہوگا جب مفسر تفسیر میں بس اتنا ہی کچھ کہے کہ حق کو دے اور اسی کو اپنی انتہا تک مقصود قرار دے لے، لیکن جب ان امور کو مقصود کے لئے وسیلہ اور مراد کلام تک پہنچنے اور حکمت تشریح سمجھنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ جس کو چند سطروں کے بعد خود علامہ رشید رضا بیان کر رہے ہیں۔ تو یہ اللہ سے اور اس کی کتاب سے دور کر دینے والا نہ ہوگا بلکہ وہ اللہ اور اس کی کتاب سے قریب کرنے والا ہوگا۔ و انتہا اعمال بالنبات (مصنف)

’ہمیں پوری طرح یقین ہے کہ مسلمانوں کے ضعف اور ان کی وسیع مملکت کے زوال کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے قرآن کی ہدایت سے روگردانی کر لی۔ اور یہ بھی مجھے یقین ہے کہ جو عزت اور سیادت و قیادت مسلمانوں نے کھو دی ہے، وہ اس وقت تک انہیں واپس نہ ملے گی جب تک وہ قرآن کی ہدایت کی طرف نہیں پلٹے۔ اُس کی رستی کو مضبوط نہ تھام لیں، جیسا کہ قرآن کی مندرجہ ذیل ان آیاتِ کریمہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے دیکھا جاسکتا ہے جو ہمارے دعویٰ پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے اور یہ اس وقت تک پورا نہ ہوگا، جب تک کہ اس کی لغت کو زندہ نہ کریں گے تو گویا اس کی طرف دعوت دینا، ہدایت کی طرف دعوت دینا ہے: —

(مقدمہ تفسیر المسارح ص ۱۸ تا ص ۲۱)



تقدیم القرآن

قرآن سمجھنے کے

بُنیادی اصول

شیخ التفسیر محمد اوس نگرانی ندوی لکھتے ہیں: —
قرآن مجید کے سچے طالب علم اور اس سے حقیقی استفادہ کرنے والے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا دل قرآن مجید کی عظمت سے معمور ہو اور یہ یقین اس کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہو —
عقیدہ کے اعتبار سے تو ہر مسلمان قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتا ہی ہے لیکن اس سے نفع اٹھانے کے لیے اس عقیدہ کا استحضار بھی ضروری ہے —

قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ قرآن کو ہم نے اتارا ہے! قرآن اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اسے خوب ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا اس طرح قرآن مجید کو اپنی طرف منسوب فرمانا اور اس نسبت کو بار بار باظہر فرمانا محض سلسلہ سند کے لئے نہیں ہے، بلکہ اس سے قرآن مجید کی عظمت اور بلندی کا اظہار مقصود ہے۔ اس لئے کہ حکم کی عظمت اس کے کلام کی عظمت سے ظاہر ہوتی ہے —
ابا م شاطبی موافقات میں فرماتے ہیں: —

جو شخص دین کو جاننا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن ہی کو اپنا مونس و ہمد بنائے شرب روز قرآن سے تعلق رکھے —
یہ ربط و تعلق علمی اور عملی دونوں طریقوں سے ہونا چاہیے ہر طرف ایک متعلق پر اتقان نہ کرے، جو شخص ایسا کرے گا امید ہے کہ وہ مقصود کو لہجی طرح مابہل کرے گا —
(الموافقات ص ۳۲۶)

جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے کلام کو عربی زبان کا لباس پہنا کر اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ بنایا۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو قرآن کی تشریح و تفصیل اور اس کی عملی تفسیر کیلئے ہادی بنایا، اس لیے قرآن مجید سے نفع اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ پورے شرح صدر کے ساتھ اس وجود گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اعتماد، اتباع اور انقیاد کا تعلق رکھے۔ آپ کے بغیر قرآن مجید سے استفادہ کی امید رکھنا ایک جھٹ فعل ہے۔ خود قرآن مجید نے اپنا اور پیغمبر کا تعلق جس طرح ظاہر کیا ہے، وہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کرنے والوں کیلئے دامن نبوت سے وابستگی از مد ضروری ہے — قرآن مجید میں ہے: —

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَلِعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ
”وہ رسول انہیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنانا ہے اور ان کے اعمال کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے“
اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی تعلیم اور اعمال کا تزکیہ کرنا نبوت کے فرائض میں داخل تھا۔ اس طرح دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے
وَاَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نَزَلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ - (نحل ۶)
”اے رسول! ہم نے آپ کی طرف نصیحت خیر کتاب اُناری ہے تاکہ جو چھ لوگوں کی خاطر نازل کیا گیا ہے تو اُسے پوری فصاحت کے ساتھ سمجھاتا رہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر تفکر کر کے ہدایت حاصل کر لیں۔“

مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم اور اس کے شرح و بیان کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے پیغمبر کے سپرد کی گئی ہے۔ اب ایلے رسول سے الگ ہو کر قرآن مجید میں غور کرنا اور اس کے مضامین سے نفع اٹھانے کی توقع رکھنا بحرِ غلطات میں قدم رکھنا ہے —
قرآن مجید سے مکمل اور صحیح استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ ہم کو اس سے نفع حاصل کرنے کی فکر بھی ہو اور اُس کے برکات سے مستفید ہونے کی

تفسیر اور اصول تفسیر

علامہ راغب الطباخ لکھتے ہیں: —

مکتشف الظنون میں علم تفسیر کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ تفسیر وہ علم ہے جس میں بشری طاقت کی مدد تک عربی زبان کے قواعد مطابق نظم قرآن کے معنی سے بحث کی جائے اور علم تفسیر کے موقوف علیہ علوم یہ ہیں —

① — علوم عربیہ ② — اصول کلام ③ — اصول احکام ④ — خلافیات اور ان کے علاوہ بعض دوسرے علوم اور علم تفسیر کی غرض و غایت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ کلام اللہ کے معانی معلوم کئے جائیں، اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ صحیح طریقہ پر احکام شرعیہ کے استنباط کرنے پر قدرت حاصل ہو اور اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو ہر حکمت کا منبع اور ہر فضیلت کا معدن ہے اور علم کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگانا چاہیے کہ دنیا و آخرت کی سعادت کا حصول اس پر موقوف ہے —

چونکہ ہر علم کی عظمت و فضیلت اس کے موضوع اور غایت کے شرف کے لحاظ سے ہوتی ہے لہذا علم تفسیر اشرف العلوم اور سب سے زیادہ عظمت والا علم ہوا۔ اور اس کی ضرورت اس لئے ہے جیسا کہ اتقان میں ہے کہ شدت حاجت کے لحاظ سے ہر کمال خواہ دینی ہو یا دنیوی اور خواہ عاجل (جلد مہل ہونے والا) ہو یا آجل (تاخیر سے حاصل ہونے والا) شرعی اور دینی علوم کی تحصیل پر موقوف ہے اور یہ علوم و معارف موقوف ہیں کتاب اللہ پر —

تفسیری سرمایہ | مؤرخ ابن خلدون لکھتے ہیں:۔

”قرآن، لغت عرب اور ان کی بلاغت کے اسلوبوں پر نازل ہوا ہے، اس بناء پر عرب اس کے مفردات اور اس کے جملوں کے معانی خوب سمجھتے اور جانتے تھے، مزید برآں قرآن تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق نازل ہوتا تھا تاکہ توحید کی تعلیم کھل کر سامنے آتی رہے اور دینی فرائض و احکام کی تعلیم جڑ پکڑتی چلی جائے، اس طرح کبھی عقائد و ایمانیات کے باب میں کچھ نازل ہوا، کبھی اعمال کی تعلیم دی —

یہ ساری باتیں صحابہ سے تابعین تک منتقل ہوئیں، پھر تابعین نے یہ امانت اپنے بعد والوں کو سپرد کی، اور یوں سلسلہ صدر ازل سے منتقل ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا، تا آنکہ ان حقائق و معارف نے باضابطہ علوم کی شکل اختیار کی اور کتابیں مدون ہوئیں، تو بہتوں نے اس (تفسیر) میں کتابیں لکھیں اور جو آثار اس باب میں صحابہ اور تابعین سے وارد ہوئے تھے، وہ سب اپنی کتابوں میں درج کئے، یہاں تک کہ طبری، واقدی اور ثعالبی وغیرہ مفسرین تک اس طرز پر کتب تفسیر کی تالیفات کا سلسلہ پہنچا اور اللہ نے جس سے جتنا چاہا (تفسیر بالانوار) قلمبند فرمایا، پھر علوم لسانیہ فن کے درجہ پر پہنچے اور لغت و اعراب اور بلاغت و نحو کے موضوعات پر تختیں چھڑیں تو ان فنون پر بھی کتابیں مدون کی گئیں حالانکہ اس سے پہلے عرب کے لیے تو یہ علوم ملکہ کی حیثیت رکھتے تھے کہ انہیں ان علوم کو نہ نقل و روایت کے توسط سے حاصل کرنے کی ضرورت تھی اور نہ کتابی علم کی انہیں

حاجت تھی، لیکن جب اہل زبان سے اصول و قواعد مستنبط ہوئے اور ان علوم نے کتابی شکل اختیار کی اور لوگ اپنے پڑانے طرز کو بھلا بیٹھے تو پھر ایسی تفسیر قرآن کی ضرورت پیش آئی (جس میں لغت و بلاغت وغیرہ سے بحث ہو) کیونکہ قرآن عرب کی زبان پر اور ان کی بلاغت کے اسلوب پر نازل ہوا تھا، اس طور پر تفسیر کی دو قسمیں ہو گئیں، ایک تو وہ جس میں وہ آثار جمع کئے گئے جو سلف سے منقول ہوئے تھے، اور اسباب نزول اور آیات کے مقاصد وغیرہ، ظاہر ہے کہ یہ وہ باتیں ہیں جو صحابہ اور تابعین سے نقل پر منحصر تھیں، چنانچہ مقدمین نے اس باب میں استیعاب کے ساتھ سب کو جمع کر دیا، لیکن ان کی کتابوں میں ایسی روایتیں بھی درج ہو گئیں جن میں صحیح اور غلط اور مقبول و مردود ہر قسم کی باتیں تھیں، اس لئے کہ عرب اہل کتاب تو تھے نہیں، بلکہ ان پر ایمیت اور بدویت کا غلبہ تھا، لہذا جب کبھی انہیں ایسی چیزوں کے جاننے کا شوق پیدا ہوتا، جنہیں فطرتاً انسانی نفوس جاننا چاہتے ہیں، مثلاً کائنات کے وجود میں آنے کے اسباب، تخلیق عالم کی ابتداء اور اس الوجود وغیرہ، تو وہ ان باتوں کی بابت اہل کتاب _____ یہود و نصاریٰ _____ سے دریافت کرتے اور ان سے استفادہ کرتے ادھر اس زمانے میں ان اہل عرب کے درمیان جو اہل تورات تھے، وہ خود انہی (اہل عرب) کی طرح بدویت کے مرتفع تھے اور ان امور (جن کی بابت ان سے اہل عرب پوچھا کرتے) سے متعلق ان کی معلومات ویسی ہی (سطحی اور بے اصل) تھیں، جیسی اہل تورات کے عوام کی تھیں، اور ایسے لوگوں میں بڑا طبقہ قبیلہ رحیمہ کا تھا، جو یہودی المذہب تھا۔ پھر جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان کی سابقہ معلومات، جنہیں احکام شرعیہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے ذہنوں میں محفوظ ہیں، مثلاً ابتداء آفرینش کے اخبار اور تاریخی واقعات و حادثات وغیرہ، چنانچہ سمان ہونانے والے ان اہل کتاب، مثلاً کعب احبار، دہب بن منبہ اور عبد اللہ بن سلام وغیرہ سے بکثرت ایسی رطب و یابس باتیں منسوب ہو کر مفسروں تک پہنچیں اور چونکہ یہ خبریں احکام سے تعلق نہیں رکھتی تھیں، جو اپنے واجب العمل ہونے کی بنا پر صحت کی تحقیق کے اہتمام و التزام کا مطالبہ کرتیں، اس لیے مفسرین نے تساہل سے کام لیا اور ایسی منقولات سے اپنی کتب تفسیر کو بھر دیا جن کا سرچشمہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، بدویت میں پروان چڑھے ہوئے وہ اہل کتاب تھے، جو اپنی اوٹ پٹانگ باتوں کی تحقیق کر لینے سے بے نیاز تھے، اور جو نقل کرتے، اس کی صحت معلوم کر لینے کی فکر سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے، لہذا ایسے حضرات کے اسلام لانے کے بعد جب ان کی تدریس و منزلت بڑھ گئی، اور دین و ملت میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہوا تو ان کی شخصیتوں پر بھر دوسہ کرتے ہوئے، قدیم اخبار اور سرگزشتوں کے باب میں جو انہوں نے کہا، لوگوں نے مان لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے حقیقت اور غلط روایتیں پھیل گئیں، پھر (تفاسیر میں ان منقولہ روایات کی) تنقید و تحقیق کی طرف لوگ متوجہ ہوئے، جن میں علمائے متاخرین میں سے ابو محمد بن عطیہ مغربی کا نام سرفہرست ہے، چنانچہ انہوں نے تمام تفاسیر پر ناقدانہ نظر ڈالی اور رطب و یابس کو چھانٹ کر جہاں تک ممکن ہو سکا صحت کے قریب روایتیں اختیار کرتے ہوئے خود ایک تفسیر لکھی، جو مغرب و اندلس میں پسندیدہ نظر سے دیکھی گئی اور مقبول و متداول ہوئی پھر قرطبی نے ان کی روش اختیار

اے یہ وہی کعب الاحبار ہے جس نے لولاک لما خلقت الافلاک، کی حدیث وضع کر کے یہ تاثر دیا ذات نبویہ تخلیق کائنات کی علت غائیہ ہیں۔ عالم ارواح میں آپ کا نبوة سے موصوف ہونا۔ ساری کائنات کی نعمتوں کا آپ کے وجود سے اجر ثابوت کرنا یہ سب نظریات حدیث لولاک سے اختراع کئے گئے ہیں، حالانکہ محدثین کے نزدیک یہ حدیث بالاتفاق موضوع ہے (اسدی غفرلہ)

کرتے ہوئے تفسیر میں ایک کتاب تالیف کی جس نے مشرق میں شہرت عام اور مقبولیت حاصل کی —
تفسیر کی دوسری قسم وہ ہے جس میں زبان و ادب کے محور پر بحثیں گردش کرتی ہیں تاکہ لغت و اسرار اور بلاغت کو جتنا
داخل مقاصد اور اسالیب کے مطابق معنی کے ادار کرنے میں ہے، ان کی معرفت حاصل ہو جائے، اور تفسیر کی یہ قسم اول الذکر
قسم سے کوئی جداگانہ اور منفرد حیثیت نہیں رکھتی، کیونکہ اول الذکر تو مقصود بالذات ہے اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ لغت
و اسرار اور بلاغت سے تو بحث ہو اور قرآن کے معانی، اس کے قصص اور واقعات و حوادث وغیرہ سے صرف نظر
کرتے ہوئے ان سب کو ترک کر دیا جائے، لیکن جب علومِ اسلامیہ نے ایک فن اور صنعت کی حیثیت اختیار کی تو تفسیر
میں ان مباحث نے جگہ حاصل کی، ہاں کچھ تفاسیر ایسی ضرور ہیں جن میں لغت و اسرار اور بلاغت کے عناصر کو کافی حد
تک غلبہ حاصل ہے — (مقدمہ ابن خلدون)

بعض مفسرین کی بے اعتدالیوں نے چند مفسرین کی بے اعتدالیوں اور کتب کی
لغویات کا جو تذکرہ کیا ہے، وہ افادیت سے خالی نہیں، اس لئے اسے بھی جان
لینا چاہیے، وہ کہتے ہیں کہ: —

”بعض مفسرین ایسے ہیں جنہوں نے اپنی کتاب کو اس فن سے بھر دیا ہے جس کا انہیں ذوق تھا اور جس میں وہ مہارت رکھتے
تھے، گویا قرآن ان کے اسی پسندیدہ علم کا مظاہرہ کرنے کے لیے نازل ہوا ہے اور اس کے علاوہ اس کا کوئی مقصد نہیں،
باوجود یہ کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے، چنانچہ تم نحوی کو دیکھو گے کہ اسے اسرار اپنے اس کی وجہ عتدال کی کثرت تعداد کی نمائش
کرنے کے علاوہ اور کسی چیز سے سروکار نہ ہوگا، اگرچہ وہ وجوہ بعید ہی کیوں نہ ہوں اور وہ (نحوی) قواعد نحوہ،
اس کے مسائل و فروع اور اس کی خلافیات کو نہایت بسط و تفصیل سے بیان کرتا ہے جیسا کہ زجاج اور واحدی نے
”البیض“ میں اور ابو حیان نے ”البحر والنہر“ میں کیا ہے، اور تاریخ و روایات سے شغف رکھنے والے کسی صاحب
کو تم دیکھو گے کہ انہیں اپنی کتاب میں قصص و حکایات کا انبار لگانے کے سوا اور کسی کام سے کوئی واسطہ نہیں، خواہ وہ روایات
صحیح ہوں یا غلط، انہی میں سے تعلیمی ہیں اور فقیہ تو یہ چاہتا ہے کہ اس میں پوری فقہ تفصیل سے بیان کر دے، اور کبھی فقہی فروع
کے دلائل قائم کرنے میں ایسا سلسل پیدا کرتا ہے، جس کو مطلقاً آیت قرآنی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور مخالفین کے
دلائل کا جواب دینے لگتا ہے، جیسے قرطبی اور صاحب علوم عقلیہ اور بدعتی کو بجز آیات میں معنوی تحریف کرنے اور اپنے فاسد
مسک کے مطابق قرآن کو ڈھالنے کے سوا اور کوئی کام انہیں چنانچہ اگر اسے شمر برابر بھی دراز کار بات سمجھائی دیتی ہے، تو
اس کا سہارا لینے سے نہیں چوکتا یا اسے اگر پیر لگانے کے لائق بھی جبکہ نظر آتی ہے تو وہاں دوڑ لگاتا ہے —

رہا الحمد، تو اللہ کی آیات میں اس کے کھردراؤ اور اللہ پر اس کے افتراء کا حال نہ پوچھو، جیسا کہ انھیں
فِتْنَتُک سے متعلق ان میں سے بعضوں کا یہ قول ہے، کہ بندوں کو نقصان پہنچانے والا ان کے رب سے زیادہ کوئی نہیں
ہے، اور یہ قول، صاحب ”قوت القلوب“ ابو طالب مکی کی طرف منسوب ہے — اور اسی قبیل سے دو لوگ
ہیں جو بلا کسی سند کے اور سلف سے منقول کسی چیز کے بغیر اور اصول شرعیہ سے روگردانی کرتے ہوئے اور قواعد عربیہ کو
پس پشت ڈال کر قرآن میں گفتگو کرتے ہیں مثلاً محمود بن حمزہ کرمانی نے دو جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب ”النجائب الغرائب“
میں ایسے ایسے اقوال درج کئے ہیں جو سخت ناپسند اور منکر ہیں اور جن پر اعتماد کرنا ناجائز نہیں اور ان کا بیان مہر

اسلوبِ قرآن

مصطفیٰ رافعی اپنی کتاب "عجاز القرآن" میں بعنوان "اسلوب القرآن" لکھتے ہیں کہ:-

_____ "یہ اسلوبِ قرآنی ایسا ہے جو تمام کلامِ عرب میں "مادۂ اعجاز عربی" ہے جس کا کوئی عنصر بھی ایسا نہیں جو معجزہ نہ ہو۔ اور قرآن کے علاوہ عام عربوں کے کلام کا اسلوب ناممکن ہے کہ معجزہ ثابت ہو سکے۔ اسی اسلوب کلام نے عرب کو اس کے مقابلہ و معارضہ کی ہر کوشش میں ناکام رکھا اور اس کلام و اسلوب کلام میں کسی طرح کا نقص نہ لگانے سے باز رکھا، اس طرح اُن پر خود انہی کے اندر سے حجت و دلیل قائم کی اور انہیں بے دست و پا بنا کر رکھ دیا۔

بھرا اسی اسلوب نے اہل عرب کے سامنے ایک ایسی یاں و نا اُمیدی لاکھڑی کی جس سے کوئی اُمید و طمع کبھی دو جا رہی نہ ہو سکی اور ان پر عاجزی و بے بسی کو اس طرح مُستطرد کر دیا، کہ وہ ایسے اسلوب پر قدرت رکھنے کا تصور بھی نہ کر سکے، اس طرح اُن کے مزاج اور طبعی ذوق ہی نہ تھا اور وہ اگرچہ بہت تیز اور دھار دار تھا مگر اب کند ہو گیا ہے اور پہلے بہت کارگر تھا مگر اب اس میں وہ خوبیاں ہی نہیں رہی ہیں اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔

ظاہر ہے کہ وہ (اہل عرب) کلام و خطابت میں باہم مقابلے بھی کیا کرتے، شعر گوئی کے میدان میں ان کے درمیان مسابقت بھی ہوا کرتی اور شعر کے اغراض و معانی پر وہ رد و قدح بھی کیا کرتے تھے، اور یہ اس وقت کی بات ہے، جب فصحاء عرب کے نزدیک کلام کے ایک فن اور دوسرے فن کے درمیان، معانی کے فرق اور اختلاف اغراض اور کلام میں وسعت تصرف کے علاوہ اور کوئی خاص فرق نہ تھا، کیونکہ ان کا اسلوب کلام ایک قبیل اور ایک طرز کا تھا جسے ایک "جنس معروف" کہہ لیجئے، یعنی آزاد لہجہ گفتگو اور فصیحانہ خطاب، تربیت و نسق میں سادگی، مضمون و فکر میں پورا زور اور اعتماد، عبارت کی فصاحت اور ترکیب الفاظ میں حسن و خوبی، جن میں ایک لفظ بھی مبہم نہ ہو، نہ کلمہ کو بادیناوہ پسند نہیں کرتے تھے، نہ کسی خاص ترکیب کا اہتمام۔

_____ اور کسی مخصوص ساخت کا تکلف کیا کرتے اور نہ فن کارانہ صنائع و بدائع کی اسجھن میں وہ مبتلا ہوتے۔ (یعنی آورد نہ تھی، بلکہ صرف آمد تھی، خود فطرت و طبیعت اُن کے ادبی نظم و نشر کے شہ پاروں میں ان کی معاون ہوا کرتی تھی، اس لئے الفاظ اُن کی زبان پر بے تکلف جاری ہو جاتے تھے اور خیالات ان کے دماغ میں گونجے، ادھر ان کے افکار کے دھارے کے ساتھ وہ الفاظ پہنے لگتے، اُن کے تخیل کی ہر حرکت کے ساتھ با معنی الفاظ اس طرح ہاتھ باندھ کر آں کھڑے ہوتے، جیسے کہ یہی الفاظ اس تقاریر تخیل کی اساس ہیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ لفظ اسی دن کے لئے وضع ہو چکا ہے اور اسی معنی کے لئے ڈھلا ہے، کوئی دوسرا لفظ اس مضمون و تخیل کی ادائیگی کے لئے وضع ہی نہیں ہوا ہے، یہاں تک کہ اس کی جگہ پر خود مکالم کی زبان سے دوسرا لفظ بالکل غیر موزوں اور نامناسب معلوم ہونے لگتا، اور مکالم کے نقطہ نظر اور اس کی قوم کے شیوہ بیان اور اس کی زبان و لغت کے

لحاظ سے اس مقام کے لئے اس سے زیادہ مناسب ترکوئی لفظ ناممکن ہوتا تھا۔
لیکن جب اُن (اہل عرب) کے سامنے اسلوب قرآن آیا تو انہوں نے بعینہ انہی الفاظ کو اسی اسلوب میں مستعمل اور
رواں پایا، جن کو وہ دن رات بولا کرتے تھے، بالکل اسی انداز گفتگو اور اسی طرز خطاب کے ساتھ جس کے وہ عادی اور جس سے وہ
مانوس و مالوت تھے، جس میں کوئی تکلف و پیچیدگی اور ابہام نہ تھا۔

اس کے باوجود نظم قرآن کے طرق، اس کے وجوہ ترکیب، اس کے کلمات میں حرُوف کی ترتیب، اس کے جملوں میں
ان کلمات کی ترتیب اور پھر مجموعہ قرآن میں ان کے دلوں پر ایک ہیبت بیٹھ گئی اور ایک پر جلال خوف چھا گیا، ایسا خوف
جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ عرب اپنی اس فطری زبان آوری کو جسے وہ بہت قوی سمجھتے تھے، ضعیف سمجھنے پر مجبور ہو گئے اور کلام و
خطابت کے اپنے مستحکم ملکہ کو قرآنی بلاغت کے سامنے بہت پرست اور بہت پیچھے باور کرنے لگے، اور ان کے بلغا کو
اعتراف کرنا پڑا، کہ اسلوب قرآنی بیان و کلام کی وہ جنس گرامر ہے، جس تک ان کی پرواز نہ ہو سکی ہے۔ نہ ہو سکتی ہے۔
نیز اہل عرب نے شدت کے ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ یہ نظم و اسلوب خود ان کی فطرتِ انسانی کی روح اور جان ہے اور کسی
عرب کے دل و دماغ کو اس انداز نظم و بیان سے پھیرنے اور باز رکھنے کی کوئی سبیل نہیں ہے اور نہ کسی عرب کے دل و دماغ کو اس
بیان سے متاثر ہونے سے بچایا جاسکتا ہے، اس لیے کہ یہ اسلوب قرآن عرب کے لغوی کمال کا وہ رُخ ہے جسے سارے عرب کی
روح جانتی پہچانتی ہے اور جو اُن کے دلوں کی دھڑکن ہے، بلکہ ایک رمزدور ہے جو ان اہل عرب میں اپنے کو فاش کرتا جا رہا ہے،
خواہ وہ اسے کتنا ہی چھپانے کی کوشش کریں۔ یہ ان کی زبانوں پر آ رہا ہے، ان کے چہروں سے ٹپک رہا ہے اور جس دستور
کی آخری حدود تک جا پہنچا ہے۔

لہذا کسی بہانہ سازی، کسی طمع سازی اور کسی فریب کاری کہیں سے کوئی گز نہیں، کہ اس سے اسلوب قرآن کی تاثیر کو ختم کیا جائے
اور اس کو اس کے مقام سے ہٹایا جائے، اور اگر کسی نے اپنے کلام کے ذریعہ یہ چاہا یا کسی تدبیر و حیلہ سے کام لے کر اس کا ارادہ کیا تو
وہ نفوس کو ان کی طبعی خواہشات سے پھیرنے اور دلوں کو ان کی محبت و اُلفت سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، گویا نفس
کے قوی ترین جذبے کو اس کے ضعیف ترین جذبے سے دبانے کی سعی لاحاصل کرے گا، یہ قلبی لگاؤ اور فطری کشش، جیسا کہ وہ
خود جانتے تھے، ایک ایسی چیز ہے، جو کسی شخص کے کہنے سننے اور عصبیت اور اغراض و خواہشات کے تابع نہیں رہتی اس
کی تو صرف یہی صورت ہو سکتی ہے، کہ وہ شخص جلت اور قانون فطرت کو توڑے، تب انکی مُراد پوری ہو، مگر جلت اور قانون
فطرت کے توڑنے کے لیے ضروری ہے، کہ وہ از سر نو تخلیق کرے اور خالق والہ ابنِ جلتے، اور اس کا، جیسا کہ تم جانتے ہو،
نہ نام لیا جاسکتا ہے اور نہ تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

یہ وہ باتیں تھیں، جن کو بلغائے عرب نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا، اس لیے وہ قرآن کے معارضہ (قرآن جیسا کلام
پیش کرنے) سے مایوس ہو گئے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ قرآن حکیم ان کی ساری قوتِ بیانیہ ہی کو
سلب کئے لیتا ہے، طبیعت کی موزونیت اور جولانی کو ختم کئے دے رہا ہے، اور دل سے براہِ راست ٹکرا کر انہیں بے آس
اور بے سہارا بنائے جا رہا ہے جس کے مقابلہ میں کوئی حیلہ اور کوئی فریب کام نہیں دے سکتا۔

رہی امکان کی حد تک معارضہ کی صورت، جسکی خواہش ذہن و خیال میں ابھر سکتی ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ معارضہ کرنے والے کے کلام کا ایک خاص انداز و اسلوب ہو، جس پر کوئی حرف گیری کبھی نہ کی گئی ہو اور اس کے کلام میں (علم) معانی کا کوئی ایسا حکمت ہو جو اس سے پہلے بیان تحریر میں نہ آیا ہو یا صنائع و بدائع کا کوئی ایسا باب ہو جو اس کے پیشتر و نہ ہوا ہو، نیز اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے، کہ (فن معانی کے دوش بدوش علم) بیان کے تمام اسالیب و طریق اس معارض کے سامنے کھلے ہوتے ہوں، کہ وہ جس میں سے چاہے لے لے اور جس کو چاہے نظر انداز کرے، تاکہ وہ (معارض) ایک خوب کا خوب تر سے نہ سہی تو دوسرے خوب سے معارضہ کر سکے اور ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ کے مقابل میں رکھ سکے یا ایک جملہ کے مقابل دوسرا جملہ لاسکے۔

لیکن اگر کوئی معارض اس طرح معارضہ و مقابلہ پر قادر بھی ہو، تو پھر بھی اس کے لئے ایک مزید مہم سر کرنے کے کو رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ اس معارض کے کلام کی تاثیر کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے کیا اور کتنی ہے؟

اور قوم کے دل و دماغ پر اس کلام کی گرفت کس حد تک ہو سکتی ہے؟ یہ اس لیے کہ تاثیر کلام کے ذرائع و وسائل سے کام لینا اور باب بلاغت کے یہاں ایک بڑا مقام اور بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بلاغت کا یہ ایک وسیع اور اہم ترین باب ہے، اور جب فن بلاغت اور اس کے اسباب میں بصیرت سے کام لے کر ایک دوسرے کے مقابل خصم ٹھونک کر آتے ہیں تو وہ اثر انگیزی کے تمام طریقوں سے کام لینے پر مجبور ہوتے ہیں ان کا بھرپور استعمال کرتے ہیں اس لیے ہر صاحب بلاغت، اپنے کلام سے کسی جذبے کے تار کو چھیرتا ہے اور اپنے کلام کو نفس انسانی کے تاروں سے ہم آہنگ بنانے کی انتہائی کوشش کرتا ہے۔

اب ظاہر ہے، کہ وہ صاحب بلاغت، بلاغت کے دوسرے مرد میدان کے کلام میں تناسب و توازن کا کوئی خلل پائی اور قسم کا کوئی نقص، خواہ وہ معمولی سا ہی کیوں نہ ہو، ضرور محسوس کرتا ہے، یا سلسلہ کلام کی کسی کڑی میں نفس کی غفلت و بے شعوری کو پاتا ہے، یا کسی طرح کے استکراہ و تمفر کا اثر معلوم کرتا ہے، جس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، جو اہل بلاغت کو اپنے پیشرو فن میں پوش آ سکتے ہیں، اور آتے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے کلام کے کسی حصہ میں خلل یا کوئی نقص و خلل واقع ہو سکتا ہے اور کلام کے معنی کہیں سے کمزور پڑ سکتے ہیں اور اس کی معنویت اپنی عظمت و بلندی کسی مقام پر کھسکتی ہے، جس کی وجہ سے ایک ہی اسلوب میں ضعف و قوت کے اعتبار سے بڑا تفاوت اور فرق پیدا ہو سکتا ہے۔

اب اگر اس بلین نے اپنے حریف کی کمزوری اور نقص کو بھانپ لیا، تو اس کا اپنے انداز فکر اور اپنے تخیل اور اپنے کلام کے رائج و فائق توازن وغیرہ جیسی چیزوں سے، ظاہر ہے کہ مقابلہ کرے گا، اس طرح جب وہ ٹھونک بجا کر دیکھ لے گا، اور دونوں قسم کے کلام کو خوب اچھی طرح تول کر اطمینان کر لے گا، تب کہیں جا کر وہ معارضہ و مقابلہ کے میدان میں نکل سکتا ہے اور اسے اس کی سبیل نظر آ سکتی ہے اور اس طرح ایک کلام کی فوقیت اور خوبیاں دوسرے کلام پر، ایک طبیعت

کی جولانی دوسری طبیعت پر اور ایک ذہن و دماغ کی اور ایک فکر کی عظمت و روانی دوسرے ذہن و دماغ اور دوسری فکر پر آشکارا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں اور ضعف و توازن اور الفاظ کے انتخاب میں اختلاف و فرق اور ترکیب و معانی وغیرہ میں فرق مراتب، فطرت و بغاوت میں داخل ہے، بلکہ اس سے کوئی فرد بشر محفوظ نہیں ہے، تو

تو پھر یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دو شاعر ایک دوسرے کے مد مقابل آئیں یا دورِ حسنِ خواںِ حسنِ گوئی کے ہنر دکھائیں یا دو انشاء پر دامنِ ملت و کتابت کے مردِ میدان بنیں۔ یا دو خطیب جو ہر خطابت دکھائیں یا ایک کلام کا دوسرے کلام سے تقابلِ معروضِ بحث میں لایا جائے اور انصاف و نقد کے ترازو میں تول کر ایک کی برتری اور دوسرے کی کمزوری پر سارے اذہان و اذواق کا کامل اتفاق ہو جائے اور ہلاکسی تردد اور تذبذب کے ہر ذہن و ذوق پر پورے الشرحِ صد کے ساتھ یقینی فیصلہ صادر کر دے۔

اب وہ کلام جس کے ذریعہ معارضہ و مقابلہ کا ارادہ کیا جا رہا ہے، اس قرآن کی طرح ہو جس کا دقیق و جلی سب محکم و مضبوط ہو، جس کا کثیر و قلیل ایسا ہو جس کی نظیر پیش کرنی کسی کے بس کی بات نہ ہو، جس نے فن کے ہر رخنے اور ہر ملک و طریق پر قابو پار رکھا ہو اور جس معنی کو اس نے پیش کیا ہو اس کا حق ادا کر کے رکھ دیا ہو اور اپنے حریف پر اس رُخ سے توجہ کرنے کا حق و اختیار ہی سلب کر لیا ہو، جس پہلو سے وہ مقابلہ و معارضہ کرنا چاہتا ہے، علاوہ بریں وہ اپنی جامعیت میں حریف پر حملہ آور ہونے کا راستہ بند کر کے ایک باب و احد کی حیثیت اختیار کر گیا ہو جس میں کسی تلاش و جستجو کا کوئی محل و مقام نہ رہا ہو، نہ گفتگو اور اعتراض کی کوئی گنجائش ہو اور ان خوبیوں پر اس کے وقاتل و نکات مزید اضافے کر رہے ہوں، پھر وہ مجموعی حیثیت سے بھی اور اس کا ہر کلمہ اور ہر جملہ بھی فنونِ معانی و بیان پر پوری طرح مادی ہو اور ایسا فنی کمال اور ایسی جامعیت اپنے اندر رکھتا ہو جو اربابِ معانی و بیان کے یہاں شعور و وجدان سے تعلق تو ضرور رکھتا ہے مگر خارج میں جس کے اظہار و بیان پر کوئی اپنے اندر قوت نہ پاتا ہو، تو یہ ایسی خوبیاں اور خصوصیات ہیں کہ ضعف و نقص اور متذکرہ بالا فرق مراتب کے خمیر سے تیار شدہ نفسِ انسانی کسی حال میں بھی کسی مقابلہ پر کمر بستہ نہیں ہو سکتا بلکہ سنجیدگی کے ساتھ اسے سوچ بھی نہیں سکتا، یہ اور بات ہے کہ مقابلہ و معارضہ کر سکنے کے لئے محض ایک وہم میں مبتلا رہے یا اس کے مثل لانے پر قدرت رکھنے کی ڈینگیں مارے، اس لئے کہ یہ کلامِ مبین (قرآن) اپنی فطرت اور اساسی نوعیت ہی میں معجزہ ہے، جس میں نفس کی نوعیت کے سامنے صرف ایک مثالی علم آتا ہے جس کے ذریعہ اسے ان علی احکام کی نوعیت معلوم ہو جاتی ہے جس کا اس نے ادراک کیا۔

(تاریخ افکار اور علوم اسلامی ص ۱۲۸)



قرآن حکیم کے مضامین

علامہ محمد راغب الطباخ لکھتے ہیں: —

قرآن کے مضامین و مقاصد بے شمار ہیں، سب سے اقل اور اہم اللہ تعالیٰ کے وجود کا بیان ہے اور یہ کہ وہ واحد ہے، اُسے صمد ہے اور یہ کہ وہی اس کائنات کا خالق ہے اور اس کے قیام و قرار کا ہر وقت اور ہر آن سامان فراہم کر رہا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کی واحدانیت و ربوبیت کے واضح دلائل اور براہین قاطعہ کا اس میں بیان ہے اور اللہ ہی کی عبادت کی دعوت اس میں دی گئی ہے اور یہ کہ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ ان کے علاوہ قرآن حکیم میں: —

- ان احکام کا بیان ہے جن سے انسانوں کے احوال اور ان کی معیشت منظم ہو —
- نفوس کی تہذیب و اصلاح کے لیے مواظظ و حکم اور امثال پیش کئے گئے ہیں —
- ان اوامر و نواہی کا بیان ہے جن سے انسانی سعادت و اہستہ ہے —
- دلوں کی استقامت اور عزم و حوصلہ کی پختگی کے لیے انبیائے سابقین کے قصص ہیں، تاکہ ان کی اقتداء کر کے اور ان کی روش پر چل کر فوز و فلاح حاصل کی جائے —
- ان اُٹھ ساقیہ اور سرکش نفوس اور ان جباروں کے تذکرے ہیں جنہوں نے دعوت حق سے اعراض کیا اور یہ کہ جب انہوں نے داعیان حق کی دعوت کو رد کر دیا تو ان کے انکار کا نتیجہ کیا نکلا —
- آداب معاشرت اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لئے حقوق و فرائض اور عام لوگوں اور اہل و عیال کے ساتھ معاملات اور تعلقات کی نوعیت کا بیان ہے —

- اعمال خیر کرنے، شر سے بچنے اور معرفات کی تلقین کرنے پر ابھارا گیا ہے —
- آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو عجائب ہیں نیز انسانوں، حیوانوں اور نباتات میں تفکر کی طرف توجہ دلائی گئی تاکہ عبرت و بصیرت حاصل ہو اور ان آثار کائنات کے فیکری مشاہدہ سے ان کے خالق کی معرفت حاصل ہو اور اس کی عظمت کا احساس ہو۔
- اس کائنات کے انجام اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات و حقائق کی خبریں ہیں اور یہ کہ اس کائنات کے درہم برہم ہو جانے کے بعد نشاۃ ثانیہ ہوگی اور آخرت کی زندگی میں کن کو کیسے نعمات سے سرفراز کیا جائے گا اور کن کو دائمی عذاب سے پالا پڑے گا۔

۱۔ سورۃ الانعام میں ارشاد الہی ہے کہ مَا خَرَجْنَاكَ فِي الْكِتَابِ شَيْءٌ ۚ — (۱۶۴) یعنی ہم نے اس کتاب میں نہ کوئی چیز چھوڑی ہے اور نہ غافل ہوئے ہیں بیضادی کا قول ہے کہ قرآن کہیں تو تفصیل کیسا تھا اور کہیں جمالی طور سے ان سارے امور پر مشتمل ہے جن کی دین میں احتیاج ہوتی ہے (معنی)

کی طلب بھی دل میں موجود نہ ہو۔ اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے: —

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ — راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو — یہاں تقویٰ سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں ہے بلکہ لغوی معنی مقصود ہے۔ یعنی خوف و کھٹک۔ اس اعتبار سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ جن لوگوں کے قلب میں اپنی اصلاح کی کھٹک اور فکر و قصد ہے قرآن اُن کو ہدایت کرتا ہے۔ سورۃ اللیل میں ارشاد ہے: —

فَاٰمَنَ اَعْطٰی وَ اٰتٰی وَ صَدَّقَ بِالْحَسَنٰی... وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی وَ كَذَّبَ بِالْحَسَنٰی
یہاں صنعت تقابل کا استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں "اعطاء" کا ذکر ہے تو دوسری آیت میں "کذب" ہے۔
تو دوسری طرف "صدق" ہے۔ اسی طرح استغنیٰ اور اتیٰ کا تقابل ہے۔ اس تقابل کی وجہ سے تقویٰ کے معنی وہ ہوں گے جو استغنیٰ کے مقابل ہو
استغناء کے معنی بے فکری کے ہیں تو تقویٰ کے معنی ہوں گے فکر اور کھٹک کے —

حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں ابوالمعالی کے حوالہ سے اس موقع پر بڑے کام کی بات کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔
"اگر کسی کے دل میں بدعت، تکبر، خواہش نفسانی اور دنیا کی محبت موجود ہے یا وہ گناہ کا عادی ہے یا اس کا ایمان کمزور ہے
یا اس میں تحقیق کا مادہ کم ہے اور غیر مستند لوگوں کی تفسیر قبول کر لیتا ہے تو وہ نہ قرآن سمجھ سکتا ہے اور نہ اس پر اس کے اسرار کھل سکتے ہیں۔
اس کے بعد امام سیوطی نے حسب ذیل آیت سے استدلال کیا ہے —

وَسَاۤءَ صٰرِفٍ عَنْ اٰیٰتِی الَّذِیۡنَ یَتَكَبَّرُوۡنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ — (اعراف)
جو لوگ اس زمین میں ناحق جاہ و جاہلیت کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے ذہنوں سے اپنی آیات کی صحیح تفہیم چھین لیتے ہیں۔
(اتقان ص ۱۸ ج ۲ مصر)

یہ آیت بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہے: —

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِکْرٍ لِّمَنۡ کَالَ لَهٗ قُلُوبٌ وَاَلْقِی السَّمْعَ وَهُوَ شَہِیْدٌ —
"اس قرآن میں سوچنے کے اچھے مواقع ہیں۔ اس سے وہ انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنے سینے میں قلب سلیم رکھتا ہو
اور قرآن سنتے وقت پوری توجہ کے ساتھ مستحضر رہتا ہو۔"

حافظ ابن قیم اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: —

کسی چیز کی تاثیر کے لئے ضروری ہے کہ کوئی مؤثر ہو دوسرا جس پر اثر ڈالنا مقصود ہو وہ موجود، تیسرا اس میں اثر ہونے کے شرائط موجود ہوں
چوتھا، جو چیزیں اثر کو زائل کرنے والی ہوں وہ نہ ہوں۔ اس آیت میں (قرآن مجید سے استفادہ کے سلسلے میں) ان سب چیزوں کا
ذکر موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قول "اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِکْرٍ" میں مؤثر کی طرف اشارہ ہے۔ "لَمَنۡ کَانَ قُلُوبٌ" سے قلب
بیدار مراد ہے۔ اس لئے کہ نصیحت قبول کرنے کی جگہ دل ہی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: —

اِنَّ هُوَ اَذِکْرٌ وَّ قُرْاٰنٍ مَّبِیۡنٍ لِّیُنْذِرَ الَّذِیۡنَ مِنْ کَانَ حَبِطًا — (یس)

"یہ صرف خالص نصیحت ہے اور واضح کتاب، تاکہ رسول اس کتاب سے اُن لوگوں کو ڈرائے جن کے دل مردہ نہ ہوں؟"

اور اَلْقِی السَّمْعَ کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اسے کہائے دل لگا کر سنئے۔ کسی بات سے متاثر ہونے کی یہی شرط ہے۔ اور وہ شہید کا مطلب
یہ ہے کہ اس کا دل حاضر ہو کیونکہ غفلت اور بے فکری اثر نہیں ہوتی۔

پس جب مؤثر یعنی قرآن مجید اور مِلّ قابل یعنی قلب بیدار اور اثر ہونے کی شرط یعنی توجہ کامل موجود ہو اور اثر کو زائل کرنے والی چیز

بننے والے افعال کے استیصال کے لئے جو سزائیں مقرر ہیں، جیسے ہاتھ کاٹنا اور دین و ملت اور الجماعت کی حفاظت و حمایت کے پیش نظر فتنہ و فساد کے استیصال کیلئے مجوزہ سزائیں جیسے قتل مُرتدا اور باغیوں سے قتال —

نہے اخلاقی آداب تو وہ تین قسم کے ہیں، ایک قسم تو وہ ہے جو انسان کی اپنی ذات اور اس کے اخلاق کی اصلاح کے لئے ہے جیسے علم و علم، سخاوت و عفت، شجاعت، وفائے عہد اور تواضع وغیرہ، دوسرے وہ اخلاق جن کا تعلق خاندان اور افراد معاشرہ کے باہمی تعلقات سے ہے جیسے والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، پڑوسی کی حفاظت، حقوق کا لحاظ، اہل فقر کے ساتھ ہمدردی، مظلوم کی مدد، پریشان حال کی دستگیری وغیرہ اور تیسرے وہ جو رعیت کے معاملات اور ملکی سیاست کے باب میں اور باب اقتدار کے ساتھ مخصوص ہیں —

شرعیعت (قانون) اور آداب و اخلاق میں فرق یہ ہے کہ شریعت کا دائرہ مقدار اور کیفیت میں محدود ہے اور اس کے ترک و اعراض پر مقررہ عقوبت (سزا) ہے، لیکن اخلاقی آداب کی تو نہ کیفیت محدود ہے اور نہ مقدار ان کے غفلت کرنے والے کے لئے سزا مقرر نہیں ہے، بلکہ انہیں پاک نفوس کے حوالہ کر دیا گیا ہے کہ جو مبتلا و بچا جاسکتا ہے ہو جائے و ما یعلمہا الا العالمون اور یہ تمام امور، اعتقادات، عبادات وغیرہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات میں جمع ہیں — ان پانچوں انواع میں اول و اشرف اعتقادات ہیں کیونکہ وہ دائرہ علم میں ہیں اور باقی دائرہ عمل میں اور علم اس کے اور عمل عمارت اور عمارت بغیر اس کے ممکن نہیں، البتہ بنیاد بغیر عمارت کے ہو سکتی ہے اور یہ کہ علم اصل ہے اور عمل فرع اور فرع کو اصل کے بغیر ثبات نہیں جیسے اصل کا کمال بغیر فرع کے متحقق نہیں ہوتا اور سب کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اعتقاد عمل پر مقدم ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان مسلم و غیر مسلم کا یہ فرق کہ اسلام مفید ہے اور کفر نقصان رسال ہے، اعتقاد ہی کے اعتبار سے ہے، عمل کے اعتبار سے نہیں۔ اور حدیث ہے کہ اعتقاد خراب ہو تو آدمی کے اچھے اعمال (سوئے اعتقاد کے سبب بُرے اعمال بن جاتے ہیں — مثلاً یہ کہ بشرک کے عقیدے کے ساتھ کوئی بھی اچھا عمل قبول نہیں ہوتا بلکہ سب اعمال حسنہ ضائع ہو جاتے ہیں —

پھر اعتقاد کے بعد عبادت کا درجہ ہے، اور اسی لئے نماز روزہ اور غسل جنابت میں خلل ڈالنے والا مسلمانوں کی نگاہ میں مرتکب ظلم سے زیادہ گناہ گار ہے۔ اسی طرح یہود کے نزدیک ہفتہ کی تعظیم سے اعراض اور نصائک کے نزدیک عبادت کا ترک، اور مجوسیوں کے نزدیک زمرہ کا ترک انسانوں پر ظلم کرنے سے بڑھ کر گناہ ہے، کیونکہ عبادت اللہ کے حق کی حفاظت ہے اور لوگوں پر ظلم کرنے سے بچنا، حقوق العباد سے متعلق اللہ کے احکام کی حفاظت ہے (اور حقوق اللہ حقوق العباد سے مقدم ہیں، اس لئے) عابد کا درجہ ظلم سے بچنے والے سے اعلیٰ ہے۔
(مقدمۃ التفسیر ص ۷)

۵۔ قاموس میں ہے کہ کھانے کے وقت مجوسیوں کا ایک خاص طریقہ سے گنگنانے کا نام زمرہ ہے، اس طرح کہ وہ منہ بند رکھتے ہیں اور زبان اور ہونٹ کو استعمال نہیں کرتے لیکن ایک ایسی آواز ہوتی ہے جو ان کے نکتھوں اور حلق میں گردش کرتی رہتی ہے جس سے ایک دوسرے کے مفہوم کو سمجھ لیتے ہیں۔

مُتَشَابِه آیات کی علمی تشریح

مولانا حالیؒ فرماتے ہیں: —

محکمات و متشابہات کے الفاظ جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں اُن سے کیا مراد ہے؟ شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک جیسا کہ حجتہ اللہ البالغہؒ میں مذکور ہے: —

محکمات آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو — متشابہات وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں — اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن میں معنی متعدد کا احتمال ہو سکتا ہے وہ سب متشابہات کے تحت مندرج ہیں: —

دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارح کا کیا مقصد تھا؟ اہم رازنیؒ نے اس کی کئی وجوہ بیان کی ہیں مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو انہوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے وہ یہ ہے کہ ”قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراک حقائق سے بعید ہوتی ہیں۔ مثلاً انحران کے سامنے ایک ایسی سہتی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ تو ان کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے ہوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ اُن کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو اُن کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں —“

شاہ صاحبؒ نے اسی مطلب کو حجتہ اللہ البالغہؒ میں سی طرح بیان کیا ہے کہ: —

”شارح نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقائق علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل فطرت میں ودیعت تھی اُن سے خطاب کیا ہے۔ اور اسی لئے (اُن کی سمجھ کے موافق) اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ الْمُسْتَوٰی“ وہ رحمن عرش پرستوی ہوا۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حبشی عورت سے پوچھا کہ ”خدا کہاں ہے؟“ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، آپؐ نے فرمایا ”یہ مومنہ ہے“ یعنی آنحضرتؐ نے باوجود کہ آپؐ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے اس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لئے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھنے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے۔“ ان سب سوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن حکیم میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالا جمل ایمان لانا کافی تھا، اُن کو مجاز و استعارہ اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ اُمی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کر سکیں —

عہد عتیق کی کتابیں جن کو مسلمان، یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں۔ چونکہ وہ اس زمانے میں القا کی گئی تھیں جبکہ انسان کی عقل نہایت ابتدائی حالت میں تھی اس لئے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے۔ تمام عہد عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ بائبل میں ہے: —

”خدا طوفانِ نوحؑ پر اس قدر رویا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں۔ ایک دوسرے موقع پر اُس کا ایسا ہنسنہ کہ کچلیاں نظر آنے لگیں۔“

بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے مثلاً سورۃ کوثر میں ہول قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔ **وَإِذَا الْجِبَارُ عُصِّلَتْ** یعنی جب کہ عنقریب بیاہنے والی اذنیوں جھٹی پھری گی اور ان کی کوئی خبر نہ لے گا۔ "بیشک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے اس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے اور اس کی قدرت سے باہر ہے کہ اس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادراک سکے لیکن یہ سمجھنا اس کی طاقت سے باہر نہیں ہے، بلکہ یہ بیان اس کیفیت کی تمثیل ہے کہ ایک ادب چرانے والی قوم جس کی دولت ادب اور ادنیوں کے سوا کچھ نہ تھی، اس کو ہول قیامت کا تصور دلنے کے لئے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا کیوں کہ عرب اپنی معروف عادات کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اذنی بیاہنے کے قریب ہو اس وقت مالک اس کی نگرانی سے غافل ہو جائے، پس انہوں نے اس وقت کو کیسا ہولناک تصور کیا ہو گا جب کہ ایسی اذنیوں کی خبر گیری کیلئے خبر گیری کا کچھ بھی ہوش باقی نہ رہے گا۔

لیکن یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل مشابہات کا حکم خدا تعالیٰ کے ساتھ مفسر نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اس سے کس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے صبیح کو اتباع مشابہات پر سزا دلوائی اور مدینہ منورہ سے جلا وطن کر کے بصرہ کو بھیجا دیا۔ اور جب امام مالکؒ سے استوی علی العرش کا مطلب پوچھا گیا، تو انہوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ "استواء" کے معنی معلوم ہیں اور اس کی کیفیت مبہول ہے۔

اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس سے سوال کرنا بدعت ہے۔ سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہل کتاب تحریف کتب مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے۔ وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہے، کہ بلاشبہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہو سکتی۔ اور اہل کتاب اس کی مثال قائم کر چکے تھے اور چونکہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اہل دین میں عموماً باہم گہرا مشابہت رکھتے تھے اس لیے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا لہذا ان میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا۔ چنانچہ منجملہ بہت سی بندشوں کے جو شارح نے اسلام میں انسداد تحریف کے لیے باندھیں ایک یہ تھی کہ آیات مشابہات کے معنی میں جہان بین کرنے کی ملامت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ **فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ دُغْرٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ خُفَاءً الْفِتْنَةَ وَابْتِغَاءً تَأْوِيلًا** اور آنحضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ **مَنْ فَسَّرَ الْقُرْآنَ بَدَأَ بِهِ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ** اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا **مَنْ كَذَّبَ عَلَى مَقْعَدٍ فَلْيَتَّبِعُوا مَقْعَدَهُ مِنَ الشَّارِ**۔

اسی بنا پر سلف صالح مشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے باوجود یہ کہ وہ تشبہ کے عقیدے سے بالکل نمبر ہوتے اور جس بات میں تشبہ کا ادنیٰ شائبہ پاتے تھے اس سے مذر کرتے تھے پھر بھی جو آئیں تشبہ پر دلالت کرتی تھیں ان کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور ان کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ ہم آیات مشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اصلی معنوں کی جو فدا نے سر ادر لکھی ہے تصدیق کرتے ہیں اور ان کا حکم خدا پر چھوڑتے ہیں کیونکہ ان کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی بعینہ یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً یہاں وجہ یا استواء کا ترجمہ تک دوسری

زبان میں نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو انہیں الفاظ کو بعینہ ترجمے میں رکھ دیتے تھے۔ حالانکہ عربی زبان جو نزولِ قرآن کے وقت حدِ کمال کو پہنچ چکی تھی، استعارہ و کنایہ اور اقسامِ مجاز سے مالا مال تھی اور اسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا باوجود اس کے علمائے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثلِ اصل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے، تاویلِ متشابہات اور تفصیلِ بالرائے سے اجتناب کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں پر مقرر رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اس کی موید نہ ہو عموماً مبادرت نہ کرتے تھے۔ حالانکہ تفسیرِ بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی جب تک کہ اس کی تفسیر کسی قول سے ثابت نہ ہو بیان کرنے جائز نہیں ہیں چنانچہ امام غزالی اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ اللہم ففہم فی الدین وعلیکم المتادیلک لنعوذ باللہ بے کار ٹھیکر تا ہے باوجود اس کے کہ سلفِ صالحین جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تا کہ جس مصلحت سے شارع نے تفسیرِ بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا راستہ محدود رہے۔

لیکن یہ مصلحت اسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتمم بالشانِ مصلحت پیش نہ آئے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں جب ان کے اصلی معنی بیان کرنے سے علماء نے سکوت کیا اور ان کو محض حقیقی معنوں پر مقصور رکھا تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویر اور غلاۃ شیوہ عقیدہ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفے کا رواج زیادہ ہوتا گیا اسی قدر آیاتِ متشابہات کے معنوں پر زیادہ چوں چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے اب علمائے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلفِ صالح نے جو محض ازراہِ مصلحت زبانوں پر مہر لگا رکھی تھی اس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں درحقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کئے گئے ہیں بقدر ضرورت ان کے اصلی معنی صاف صاف بیان کئے جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے علمائے معتزلہ نے تاویلِ متشابہات کی راہ کھولی۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلّم ٹھہر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو عقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے، یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیل قاطع عقل کے خلاف ہوں تو اس کو اصولِ عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیئے اور یہی معنی تاویل کے ہیں۔ یہ اصول علمِ کلام کی عام کتابوں مثل مقاصد، مواقف، تفسیرِ کبیر، ذرغرر، تنہاتہ الفلاسفہ اور فصل لمقال قاضی ابن رشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے جواب بھی ایک کتاب موسوم بہ جمیعہ حکمائے زمانہ حال کے مقابلے میں لکھی ہے اس میں بھی اس اصول کو قاعدہ مسلّم اہل اسلام قرار دیا ہے، بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جو معجزاتِ حیرہ کو علومِ جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں یہ ہدایت کی ہے، کہ علیہم یحوان یقنعوا بما تقبلہ عقولہم و شو ما لم تقبلہ و یرفضہ البرہان العقلی المقاطع یرجعون فیہ الی التاویل الجامع بین النقل و العقل۔ (حمید یہ صفحہ ۲۸) یعنی ان کو چاہیئے کہ جس کو ان کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کر لیں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے۔

اگرچہ اب لو کہن اشعرى جو فرقہ اشاعرہ کے امام ہیں متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر ان کی یہ ممانعت صرف ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے مخصوص معلوم ہوتی ہے جو ان کے دارِ اربعہ کے رواد، اوشہارت سے انکار کرتے ہیں۔

یہاں اشعری اور کیا اور اسلامی فرقے سب کو ناگزیر متشابہات کتاب و سنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب میں رسالہ التفریق بین الاسلام والذمت میں لکھتے ہیں کہ "اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہو اور سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبلؒ ہیں۔ باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔" اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے ان کے کیا معنی قرار دیئے گئے۔

آیت الکوسی میں جو جملہ "وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" آیا ہے اس کی تفسیر میں امام رازی نے جو تفسیر لکھا ہے اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرسی کو پہلے ایک جسم عظیم جو آسمان و زمین پر محیط ہی سمجھا جاتا تھا بعضے اسی کو عرش اور بعضے عرش دوسری دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے، بعضے کوسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علماء کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہر سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش دوسری وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں وہ صاف صاف بیان کئے جائیں۔ چنانچہ امام رازی نے علمائے شافعیہ میں سے فقال کا یہ قول آیت مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ امراء و سلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اس نے کعبہ کو اپنا گھر بتایا ہے

طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں

اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیاء اور شہداء کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور

اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ اَلْعَرْشُ عَلَى الْعَرْشِ اسٹوٹی پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى مَاءٍ اور پھر فرمایا وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِظِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُكَبِّرُونَ بِحَمْدِکَ اور فرمایا وَیُحْمَدُ عَرْشَ رَبِّکَ فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ ثَمَنًا اور کہا الَّذِینَ یُحْمَدُونَ الْعَرْشَ مِنْ حَوْلِکَ اور اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں اذ اعرفت هذا فنقول کل ما جاء من لا الفاظ الموصیة التشبیہ فی العرش والکوسی فقد ورد منہا بل اقوی منها فی الکعبۃ والصلوات ولما کوا فقتنا

ہرہنا علی ان المقصود تعریف عظمتہ اللہ وکبریٰ ما سلم القطع بانہ من کما عن ان یکون فی الکعبۃ فکذا الکلام فی العرش والکوسی یعنی جب تم فقال کا قول سن چکے تو اب میں کہتا ہوں کہ جسے الفاظ موہم تشبیہ عرش دوسری کے متعلق واقع ہوئے ہیں ویسے ہی بلکہ ان سے زیادہ موہم تشبیہ کعبہ اور صلوات کے متعلق آئے ہیں۔ پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا کہ الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریائی کا تصور دلانا ہے اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبے میں ہونے سے پاک ہے، تو ہم کو ایسا ہی عرش دوسری کی نسبت سمجھنا چاہیے۔

لیکن چونکہ اُس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لئے بہت سے شبہات جو اس زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں، اُس زمانے میں اُن کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو درحقیقت تاویل طلب تھیں اُن کی تاویل کرنے کی ضرورت علمائے سلف کو محسوس نہیں ہوئی، مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظ قرآنی میں شک اور دوسوے نے راہ نہیں پائی لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو جن سے زمین کا مثل فرش کے سمجھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے ان کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے۔

ومن ذلك المتشابهات) امور كثيرة لا يدري اراءه حقيقة الكلام واقرب مجاز اليها وذلك فيما لو يجمع عليه لامتة لو ترتفع فيه الشبهة۔ یعنی قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابهات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ ان کے حقیقی معنی مقصود ہیں۔ ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں، اور یہ تردد ان بیانات میں جن کی نسبت اجماع اُمت سے فیصلہ نہیں ہوا اور استتہاء رفع نہیں ہوا۔

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے اور باوجودیکہ صد ہا تفسیریں نہایت مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ ان مقامات پر جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں کو مکمل ہیں ان کے درحقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی۔ قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابهات کے باب میں لکھا ہے۔ تفسیر کبیر اور حجتہ اللہ البالغہ کے دیگر حوالوں سے جو ہم پہلے دے چکے ہیں صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافرانہام کی ہدایت کے لئے نازل ہوتا ہے اس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی سمجھ اور اپنی اپنی معلومات کے موافق اُس سے ہدایت پا سکیں جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور اُس کی سمجھ ابتدائی حالت میں ہو اُس وقت بھی اُس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو۔ ورنہ اُس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافرانہام کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے اور اُس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے کلام الہی نئی تفسیریں سے بالکل مستغنی ہو جائے کیونکہ جس قدر انسان پر حقائق موجود زیادہ منکشف ہوتے جاتے ہیں اُس قدر کلام الہی کے معنوں سے زیادہ پُرے مرتفع ہوں گے۔

علامہ ابن الحجاج اپنی مشہور کتاب "مدخل" میں لکھتے ہیں: قال عليه الصلوة والسلام في القرآن "لا تنقض عجمي" ولا يخاف على كثرة الرد فعجائب القرآن لا تنقض الى يوم القيمة فكل قرن لا بد له ان ياخذ منه فوائد حتمية خصه الله تعالى بها و وضعها اليه بركة هذا الامت مستمرة الى يوم الساعة۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ: اس کے عجائب یعنی وقائع و اسرار جو اس میں مضمر ہیں ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرائے کے پُرانا نہ ہوگا۔ پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں۔ اور اس لئے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیے کہ اُس سے فوائد کثیرہ جو ان کے حصے میں آئے ہیں حاصل کریں تاکہ اُس اُمت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے۔ اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں: قال عليه الصلوة والسلام مثل امّتي كمثل المصطفى لا يدري اقله خير ام اخره، یعنی فی البركة والخير والدعوة الى الله تعالى وتبيين الاحكام۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمت کی شان ہارش کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر۔ یعنی برکت اول خیر میں لوگوں کو فدا کی طرف بلانے میں اور احکام الہی کے بیان کرنے میں۔

دونوں مذکورہ بالا صیغوں سے جو علامہ ابن الحجاج نے نقل کی ہیں صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور وقائع ہمیشہ واقفیتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور جس طرح اُمت کے اول قرون میں قرآن کے بہت سے وقائع و اسرار حقیقت پر ظاہر ہوئے ہیں اسی طرح اس کے اخیر قرون میں بہت سے وقائع و اسرار دنیا پر منکشف ہوں گے۔ حجة الاسلام امام غزالی اس بات میں لکھتے ہیں کہ من معان دققة من اسرار القرآن يحظر على قلب المتعبد دين للذكر والفكر مخلوع عنها الخ۔ یعنی قرآن ایسے بہت سے وقائع و اسرار جو تفسیر کی کتابیں غالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسرین انکی خبر نہیں ہوتی ان لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو بہت قرآن کے ذکرا و فکریں مہو ہوجاتے ہیں۔ (جواب القرآن)

محکم اور متشابہ اور آیات صفات

(مُتَشَابِه آیَات کی علمی تشریح)

پروفیسر لطفی اپنے علمی مقالے میں لکھتے ہیں: —

علم الاصول میں محکم اور متشابہ کا لفظ زیادہ تر اسی خاص اصطلاح کے لئے مستعمل ہے، دوسری اصطلاح جس کو عام کہا گیا ہے یہ ہے کہ محکم ہر وہ آیت ہے جو اپنے مدلول میں اتنی واضح اور صریح ہو جس کے لئے کسی تفسیر اور تاویل کی ضرورت نہ پیش آئے اور جس کے مفہوم اور مدلول کے سمجھنے میں عربی زبان کے ماہر کو کسی طرح کا تردد اور تذبذب نہ ہو۔

اس موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: کہ آیت کے مفہوم اور مدلول سمجھنے کا معیار صرف عربی زبان دانی اور مہارت تاہم نہ کہ نکتہ سنجی اور قیاس آرائی کیونکہ بعض حضرات اپنی بے عمل مونہ شاکیوں اور بے ضرورت قیاس آرائیوں کی وجہ سے محکم کو متشابہ اور آسان کو مشکل اور صاف اور واضح بات کو مبہم بنا دیتے ہیں جس سے قریب الفہم مطلب بعید از فہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

متشابہ ہر وہ آیت ہے جو اپنے مدلول اور معنی کے لئے محتاج بیان ہو، کیونکہ اس میں ایک وقت ایک سے زائد معنی سمجھے جاسکتے ہیں اور ظاہر میں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہوتا جس سے کسی ایک معنی کے حق میں قطعی فیصلہ کیا جاسکتا ہو۔

متشابہ میں اس قسم کے احتمالات مختلف اسباب کی بناء پر پیدا ہو سکتے ہیں جیسا کہ شاہ ولی اللہ کی کتاب "الفوز المجیر"

احتمالات اور ان کے اسباب کو بطور نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ اشتباہ اس وقت بھی ہوتا ہے جب کلام میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کے ایک سے زائد معنی پائے جائیں اور تمام معانی کی حیثیت مساوی ہو جیسے قرآن کی آیت "اولاہمستم النساء" میں لفظ لائم کے معنی چھوٹنے کے بھی ہیں جیسے کہ اس کے معنی ہمستری کے بھی ہیں ایسی صورت میں جب تک کوئی ایسا قرینہ یا توجیہ نہ کی جائے گی جس سے ایک معنی کو متعین کیا جاسکے اس وقت تک اس آیت کا واضح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا۔

(۲) کبھی اشتباہ اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ جملہ میں کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہو جس کا عطف مختلف کلمات پر ہو سکتا ہو اس وقت کسی ایسے قرینہ کی ضرورت ہوگی جس سے معلوم ہو سکے کہ دونوں کلمات میں سے کس کلمہ پر عطف مراد ہے۔ جیسے قرآن کی آیت "وامسحوا برؤسکم وارجلکم" میں لفظ ارجل کا عطف رؤس پر بھی کیا جاسکتا ہے اور اس صورت میں ارجل مجرور ہوگا اور اس کا تعلق امسحوا فعل سے ہوگا اور پاؤں کا مسح کو نافرض ہوگا، شیعہ کے نزدیک یہ صحیح ہے۔

اس کے برخلاف ارجل کا عطف آیدیکم اور وجہم پر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس وقت یہ منصوب ہو کر غسلوا فعل کا مفعول ہوگا اور پاؤں کا دھونا نافرض قرار پائے گا، چنانچہ علمائے اُمت نے یہاں متعدد قرآن سے واضح کیا ہے کہ آیت میں یہی آخری شق مراد ہے۔ اور شیعہ کا استدلال کمزور ہے۔

(۳) جملہ میں کسی جگہ ضمیر کا استعمال اس طرح ہو کہ اس سے قبل دو اہم ذکر کئے گئے ہوں اور دونوں اسم اس ضمیر کا مرجع بن سکتے ہوں تاوقتیکہ اس کی وضاحت نہ کی جائے کہ یہ ضمیر کس اسم سے متعلق ہے۔ جملہ کا مفہوم اور آیت کا مدلول واضح نہیں ہو سکتا۔ جیسے: اِنَّ الْاَمْرِ فِیْ اَیِّ اَلْعَن فَلَا نَا لَعْنَةُ اللّٰهِ (مجھے امیر نے حکم دیا کہ میں فلاں آدمی پر لعنت کروں، اللہ اس پر لعنت کرے)، لَعْنَةُ میں لا ضمیر کا مرجع امیر بھی ہو سکتا ہے اور فلاں بھی تاوقتیکہ اس کی وضاحت کسی قرینہ سے نہ ہو کہ کہنے والے کی مراد اس ضمیر سے کون ہے امیر یا فلاں؟ اشتباہ اور احتمال قائم رہے گا۔

(۴) اشتباہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ آیت میں کوئی فقرہ استعمال کیا گیا ہو جس میں اس فقرہ اور حصہ کی مستقل حیثیت بھی قرار دی جا سکتی ہے کہ اس کو جملہ متانفہ کہا اور اس امر کا بھی احتمال ہے کہ اس کا عطف اپنے ماقبل پر کیا جائے۔ دونوں صورتوں میں آیت کے معنی مختلف ہوں گے۔ مثلاً قرآن کی آیت ”لَا یَعْلَمُوْا تَاوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ“ میں یہ بھی احتمال ہے کہ ”وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ“ کا عطف ”اللہ“ پر ہو۔ جو ماقبل میں مذکور ہے، اس صورت میں آیت کے معنی ہوں گے کہ اس کی تاویل اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ لوگ جانتے ہیں جو علم میں مہارت رکھتے ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ ”وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ“ جملہ متانفہ ہو، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے تو پھر یہ ایک علیحدہ مستقل کلام قرار پائے گا اور آیت کا مفہوم ہو گا کہ ”اس کی تاویل بجز خدا کے دوسرا کوئی نہیں جانتا، اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے جو بھی خدا کے نزدیک اس کا مفہوم ہے۔ محققین کے نزدیک پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

غرض کہ اصطلاح عام کی رو سے متشابہ اس آیت کو کہا جائے گا جو ان احتمالات کی وجہ سے تشریح اور توضیح کی محتاج ہو اور جب تک اس کی تشریح نہ کی جائے اس کا مفہوم واضح نہ ہو۔ مفسرین کے نزدیک محکم اور متشابہ کے الفاظ سے یہی دوسری اصطلاح مراد ہوتی ہے ”جسے عام“ کہا گیا ہے اس عام اصطلاح کی بناء پر مجمل، عام اور مطلق تمام آیات متشابہ قرار پاتی ہیں کیونکہ عام میں تخصیص کی گنجائش ہے، مطلق میں تفسیر کی اور مجمل میں تفصیل کی۔

اشتباہ کی مندرجہ بالا صورتوں میں سے بیشتر صورتیں ایسی ہیں جن میں بیان کے ذریعہ آیت کے تشابہ کو رفع کر دیا گیا ہے۔ مثلاً مطلق میں جو اشتباہ ہوتا ہے، تفسیر کے آنے کے بعد وہ تشابہ زائل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مجمل کے تشابہ کو بیان اور تشریح سے رفع کر دیا جاتا ہے اور اس قسم کے تشابہ کا کسی کلام میں پایا جانا اس کلام کی افادیت اور معنویت پر کسی اعتبار سے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بلاغت کے اعتبار سے کلام کے یلغ ہونے کا ثبوت ہے۔ قرآن حکیم میں جو متشابہ آیات ہیں، یا جن آیات کو متشابہ قرار دیا جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں (۱) ایک قسم ان آیات کی ہے جن کا تعلق احکامی آیتوں سے ہے۔ اس قسم کی تمام متشابہ آیتوں کی وضاحت کر دی گئی ہے، یعنی ان کے تشابہ کو تعین مراد کے ذریعہ رفع کر دیا گیا ہے۔ محققین علماء ایسی ہی آیات میں غور و فکر کرتے ہیں اور ان آیتوں کے تشابہ کے رفع کرنے کے لئے دلائل اور قرآن کی جستجو کرتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی اس جستجو میں علماء کے درمیان نظریات میں اختلاف ہوتا ہے اور کبھی تمام علماء نتائج و نظریات پر باہم متفق بھی ہو جاتے ہیں۔

تعیین مراد کی اس جستجو اور طلب کو اصطلاح میں ”رد المتشابہ الی المحکم“ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی کو علامہ راغب اصفہانی نے ”من وجہ محکم من وجہ متشابہ“ سے تعبیر کیا ہے (۲) دوسری قسم ان متشابہ آیات کی ہے جن کا تعلق احکامی آیات اور قوانین شرع سے نہیں ہے، بلکہ صفات باری تعالیٰ سے ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات ہیں۔ ”الرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی“ ”اَیْمٰنًا تَوَلّٰوْا فِیْہِ وَجْہُ اللّٰہِ“ ”مَنْ شِئِیْ هٰلَکَ الْوَجْہُ“ ”یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہُمْ“ ”وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوٰیٰتٌ بِیَمِیْنِہٖ“ ”وِیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ“۔ ”یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَآوٰتٍ“ وغیرہ۔

یعنی غفلت اور بے فکری موجود نہ ہو تو (ان شاء اللہ) مقصود یعنی قرآن سے پورا نفع حاصل ہو جائے گا۔ (التفسیر الیقین ص ۴۴۴)

قرآن مجید کے طالب علم کا ذہن اس معاملہ میں بھی صاف ہونا چاہیے کہ ہم کو قرآن مجید سے کن امور میں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کا مجموعہ اور اس کا عنوان کیلئے ہے اس عقدہ کامل نہ ہونے کی وجہ سے اس راہ کے کھنکھنے مسافر منزل سے دور رہ جاتے ہیں۔ وہ سراب کو اپنی تشنہ لبی کا سامان سمجھ لیتے ہیں اور نتیجہ لکھا "حیرانی اور پریشانی کے سوا انہیں کچھ بھی ہاتھ نہیں آیا۔"

اس حقیقت کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن مجید کی اصل دعوت انسان کو سعادت ابدی کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ انسان کے ظاہر و باطن کی ایسی تعمیر کرنا چاہتی ہے کہ حیات اخروی میں اس کو کوئی زحمت پیش نہ آئے۔ اور یہ کتاب انسان کا ایسا تزکیہ کرنا چاہتی ہے کہ وہ بارگاہِ خداوندی میں حضوری کے لائق بن سکے۔ بلاشبہ قرآن مجید نے دنیاوی زندگی کے تمام اصول و قواعد مرتب فرمائے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، حقوق اور آداب ان سے بحث فرمائی ہے مگر ان تمام امور میں بنیادی نقطہ نظر اخروی سعادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مباحث کا جن آیات میں ذکر آتا ہے ان کے اوّل یا آخر میں یا درمیان میں ترغیب یا ترہیب کی آیتیں، جنت و دوزخ اور عذاب کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسما حسنہ میں توفیق کے اعتبار سے کسی مناسب اسم و صفت کا تذکرہ بھی ضرور ہوتا ہے تاکہ پڑھنے والا یہ بات سمجھتا ہے کہ ان قوانین کی پیروی کے نتیجے میں ابدی راحت اور نافرمانی کی صورت میں اخروی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اہم شاہی نے بڑے کام کی بات کہی ہے۔ آپ فرماتے ہیں، قرآن مجید کے اصل علوم تین ہیں۔ (۱) ذات حق کی معرفت۔ (۲) حق تعالیٰ کی رضا کی صورتیں۔ (۳) انسان کا انجام۔ پہلے علم یعنی ذات حق تعالیٰ کی معرفت میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور افعال کا علم داخل ہے۔ اور اسی سلسلہ میں نبوت بھی داخل ہے۔ اس لیے کہ عباد اور معبود کے درمیان یہی واسطہ ہے۔ دوسرے علم میں احوال اور معاملات وغیرہ داخل ہیں۔ تیسرے علم میں موت اور اس کے احوال، قیامت اور اس کے مشتملات۔ اور جنت و دوزخ کے احوال داخل ہیں۔ اسی قسم میں ترغیب اور ترہیب کی آیات اور وہ آیتیں جن میں اچھے لوگوں کی نجات اور بُکارتوں کے بُرے انجام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہیں۔ (الموافقات ص ۱)

قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن اس کے بعد سنت اور پھر اقوال صحابہ و تابعین کی طرف رجوع کیا جائے۔ قرآن عربی زبان میں ہے۔ اس لئے بلاشبہ قرآن کے الفاظ کی تشریح کے سلسلے میں لغت عربیے بھی چارہ نہیں۔ لیکن اس لسانی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قرآن کی کچھ خود اپنی اصطلاحات ہیں اور انہیں صرف کتاب و سنت ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً سورۃ فاتحہ میں لفظ "صراط مستقیم" ہے لغت میں جس کے معنی "سیدھے راستے" کے ہیں مگر قرآن نے "صراط مستقیم" کے لفظ سے کون سا سیدھا راستہ فرمادیا ہے۔ اس کی تشریح اس کے متصل خود ہی فرمادی۔

صراط الذین انعمت علیہم۔۔۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا۔

انعام کن لوگوں پر ہوا ہے اس کی تشریح ایک دوسرے مقام پر کر دی گئی ہے۔

ومن یطعم اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصلیین
والشہداء والصلحین۔

"جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ وہ لوگ انبیاء، مدقین،

اور صالحین کی جماعت ہے۔" اس سورۃ آل عمران کے آخر میں فرمایا کہ۔

"زمین و آسمان کی پیدائش اور شب و روز کے الٹ پھیر میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ قرآن مجید نے اس موقع پر

مذکورہ بالا آیتیں اور اس قسم کی دوسری آیتیں جو بظاہر اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ کے لئے وہ چیزیں ثابت کی گئی ہیں جو مخلوقات کے لئے ثابت ہیں، جن سے خدا کا جسم اور ممکنات سے ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ ان تمام آیتوں کو علامہ راغبؒ نے "مطلقاً متشابہ" آیات میں شمار کیا ہے۔

ان آیتوں میں بندوں سے کسی قسم کے عمل کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، اس لئے بعض صحابہؓ اور تابعینؓ ایسی آیتوں میں توقف کرتے ہیں اور ایسی آیات کے معانی اور مراد کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کے مفہوم اور معانی کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم ان آیتوں پر کیفیت اور حقیقت کے بدلنے کے بغیر ایمان لاتے ہیں جیسا کہ امام مالکؒ سے آیت (الرحمن علی الرحمن استوی) میں استواء کی کیفیت کے متعلق پوچھا گیا تو جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ "استواء" معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول ہے۔ اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس میں غور و خصوص کرنا ممنوع ہے۔

لیکن جب یونانی فلسفہ کے اثر سے ذہنوں میں انتشار پیدا ہونے لگا اور صحابہؓ اور تابعینؓ کا یہ سادہ طریقہ متاثرہ ذہنوں کو مطمئن نہ کر سکا اور قرآن حکیم کی اس قسم کی آیتیں کج رویوں کے لئے مزید تشویش کا باعث بن گئیں جن آیات کے استعمال سے بظاہر اللہ تعالیٰ کے لئے جمیعت جہت اور مکانیت ثابت ہونے کا شبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کی وجہ سے شبہ اور مجسمہ دو گروہ پیدا ہو گئے، تو علمائے متاخرین نے تفحص و تلاش کے بعد محاورات کلام اور استعمالات عرب کے مطابق ایسی آیات کی اس طرح توجہیں کیں جن سے ان شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جائے، چنانچہ امام اشعریؒ، امام غزالیؒ اور دوسرے محکمین نے ان آیات پر اور ان کی تاویلات و توجہات پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں، ان کی بحثوں کی تفصیل و طرح پر کی جا سکتی ہے۔

پہلا طریقہ "استعارہ" ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے الفاظِ تدبیر و توجہ کشفِ ساق اور استواری اپنے حقیقی اور ضعیف مفہوم کے اعتبار سے استعمال نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ان الفاظ سے ان کے مجازی معنی مراد ہیں۔ نہ کہ وضعی حقیقی معنی۔

لفظِ تدبیر قدرت کے معنی کے لئے، لفظِ توجہ ذات کے مفہوم کے لئے، استواء غلبہ اور اقتدار کے مفہوم کے لئے اور کشفِ ساق شدت کے لئے استعارۃ استعمال کئے گئے ہیں۔ امام رازیؒ کے نزدیک دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کے تمام الفاظ کا استعمال خدا کی نسبت، غایات کے اعتبار سے ہے نہ کہ مبادی کے اعتبار سے۔ ہر لفظ کا ایک مبداء ہوتا ہے اور اس کی ایک غایت ہوتی ہے۔ جیسے لفظِ تدبیر کا مبداء ایک جسمانی عضو ہے جو گوشت و پوست سے بنا ہے۔ اس کی غایت قبضہ و قدرت ہے۔ خدا کی نسبت لفظِ تدبیر کا اطلاق غایت کے اعتبار سے ہے۔ مبداء کے اعتبار سے نہیں۔ اسی طرح توجہ وغیرہ الفاظ میں خدا کی طرف ان کی نسبت سے مراد ان کی غایت ہوں گی نہ کہ ان کے مبداء افراد ہوں گے۔ اور یہ قاعدہ کچھ ان ہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جتنے الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کے حق میں بولے جاتے ہیں سب میں یہی اصول جاری ہوگا۔ جیسے استعجا، سمع، بصر، علم وغیرہ الفاظ ہیں۔ علم کا مبداء ذہنی صورت ہے اور اس کی غایت انکشاف ہے۔ اللہ کے لئے جب اس لفظ کو بولا جائے گا تو اس سے علم کی غایت یعنی انکشاف مراد ہوگا۔

جہاں تک متشابہات کی متذکرہ بالا قسم اول کا تعلق ہے یعنی ایسی متشابہ آیات جن کا تعلق احکام اور قوانین شرع سے ہے اور جن کو علامہ راغبؒ نے "من وجہ حکم من وجہ تشابہ" لکھا ہے۔ ان کے مفہوم و مراد کی بابت غور و فکر کرنا اور ان کی تاویل تعین مراد کے لئے فکر و نظر کے باب میں سلف سے خلف تک سب کا اتفاق ہے۔ ان میں غور و فکر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، کیونکہ ان لئے البتہ اس غور و فکر کے لئے اہمیت شرط ہے، کیونکہ کسی بھی فن میں نا اہل کی رائے مردود ہوتی ہے۔

ان آیات میں بندوں سے عمل کا مطالبہ کیا گیا ہے جو بغیر واضح علم ناممکن ہے اس لئے ان آیات کے واضح معانی اور متعین مفہوم کا علم حاصل کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور درحقیقت تفسیر و تاویل کا اصل میدان ہی یہ ہے اور اس قسم کی آیات متشابہات کی تشریح میں بہت سی حکمتیں مخفی ہیں جن میں سے چند حکمتیں درج کی جاتی ہیں: —

(۱) ایک حکمت یہ ہے کہ علماء محققین کے لئے غور و فکر کی دعوت کا موجب ہے، جس سے قرآن حکیم کے بہت سے مخفی اسرار کا پتہ چلتا ہے۔ (۲) ایک حکمت یہ ہے کہ اس قسم کی آیات سے انسانوں کی فہم اور ان کے علمی مرتبوں کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ ورنہ اگر تمام قرآن حکیم صرف محکم آیات سے بھرا ہوا ہوتا جن میں غور و فحس اور بیان و تشریح کی ضرورت پیش نہ آتی تو اس کے سمجھنے میں تمام لوگوں کا درجہ مساوی ہوتا اور اہل علم کے علم و فہم اور ان کے ادراک کے درجات کا پتہ نہ چلتا۔ (۳) ایک حکمت یہ ہے کہ متشابہات کا بیان کرنا معانی اور مراد کی گہرائی تک پہنچنے کے لئے مزید مشقت اور دقت نظر کا باعث ہوتا ہے۔ اور جتنی مشقت اور محنت و کاوش زیادہ ہوگی اتنا ہی ثواب بھی زیادہ ملے گا۔ (۴) ایک حکمت یہ ہے کہ قرآن میں متشابہات کی وجہ سے ان کی تاویل کے طریقوں کا علم، ایک آیت کو دوسری آیت پر ترجیح دینے کا اصول معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور یہ علم زبان دانی قواعد صرف و نحو، علم بیان، علم اصول تفسیر و فقہ وغیرہ علوم حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ اگر متشابہات آیات نہ ہوتیں تو مذکورہ بالا علوم کے حاصل کرنے کی طرف ہماری توجہ نہ ہوتی۔ یہ آیات متشابہات ہی کی برکت ہے کہ لوگ ان علوم کو سیکھتے ہیں اور فوائد کثیرہ حاصل کرتے ہیں —

متشابہات کی دوسری قسم یعنی قرآن کی وہ آیات جن کا تعلق احکام و قوانین سے نہیں اور جو بندوں سے کسی عمل کا مطالبہ نہیں کرتیں مثلاً وہ آیات جن میں صفات الہی کا ذکر ہے اور جو بظاہر اللہ سبحانہ کی تشریح و شان کے خلاف معلوم ہوتی ہیں اور ان کے علاوہ قرآنی سورتوں کے بیشتر ابتدائی کلمات جن کو فوارج سور اور حروف مقطعات کہا جاتا ہے اور علامہ راغب اصفہانیؒ کے الفاظ میں مطلقاً متشابہات میں شامل ہیں، اس قسم کے بارے میں علماء کے درمیان یہ اختلاف رائے ہے کہ آیا قرآن کی ایسی متشابہات آیات کے معنی و مدلول پر آگاہی ممکن ہے اور کیا ان کے معنی و مراد کی تفسیر و تاویل کے لئے جدوجہد اور غور و فکر کرنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے، یا ان کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اور ان کی تفسیر و تاویل کے لئے سعی و جستجو کرنے کا دروازہ بندوں کے لئے بند ہے —

یہ اختلاف دراصل نتیجہ ہے قرآن حکیم کی مندرجہ آیات "والراسخون فی العلم" کے سمجھنے کے بارے میں اختلاف کا..... کیونکہ اس سلسلہ میں علماء کے دوسمک ہیں: —

(الف) "والراسخون فی العلم" میں وادعاطفہ ہے اور یہ جملہ معطوف ہے اور اس کا عطف اپنے ماقبل لفظ پر اللہ ہے گویا اللہ کا لفظ معطوف علیہ ہے، اس صورت میں "والراسخون فی العلم" اپنے ماقبل لا یصلو فعل کا فاعل ہوگا اور معنی ہوں گے کہ "متشابہ کے مفہوم اور تاویل کو اللہ تعالیٰ اور ماہرین علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا —

(ب) آیت "والراسخون فی العلم" میں وادعاطفہ نہیں، استینافیہ ہے۔ اور یہ پورا کلمہ مبتدا ہے اور اس کے بعد میں جو یقولون مذکور ہے، وہ اس کی خبر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ بنیں گے کہ متشابہ کے مفہوم اور مراد کو بس اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور ماہرین علم اس قسم کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں کہ جو بھی ان کی مراد اور مفہوم عند اللہ ہو وہ حق اور درست ہے —

پہلے خیال والے علماء، کا جن میں مشہور مفسر مجاہد اور امام نوویؒ بھی شامل ہیں، ان کا قول یہ ہے کہ متشابہ کی دوسری قسم کے مفہوم و مراد پر آگاہ ہونا ممکن ہے اور ان آیات کی تفسیر و تاویل کے لئے سعی و جستجو کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اس کے لئے راسخین علم کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ اس کے معانی میں غور و فکر کریں، کیونکہ یہ بات قیاس اور فہم سے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ایسے الفاظ و کلام سے

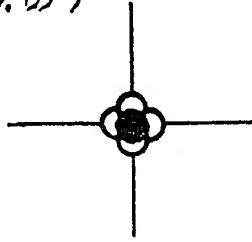
سے خطاب کرے جن کو بندوں میں سے کوئی جان ہی نہ سکے۔ محققین کے نزدیک رائج قول یہی ہے —
 دوسرے خیال والے علماء جن میں بعض صحابہؓ اور تابعینؓ شامل ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ متشابہات کی مذکورہ دوسری قسم کے مفہوم اور معانی کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔ اور ان کی تفسیر و تاویل میں بدوہد کرنا انسان کو فتنہ میں مبتلا کرنے کا سبب ہے اس لئے ان آیات میں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ آیات ہیں اور جو بھی ان کا مفہوم عند اللہ ہے۔ ہمارا اس پر ایمان و یقین ہے۔ اکثر سلفیہ اور اہل حدیث کا یہی مسلک ہے لیکن ان کی بعض توجہات سے خدا تعالیٰ کی تقسیم ثابت ہو جاتی ہے اس لئے ان کو ایسے غلو سے اجتناب کرنا چاہیئے —

(ب) آخر میں ایک دل چسپ اختلاف کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے، جو علماء کے درمیان ہے: —
 (الف) تمام قرآن حکم ہے جیسا کہ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کتاب احکمت آیاتہ — (جز ۱)
 (ب) تمام قرآن متشابہ ہے جیسا کہ آیت مندرجہ سے ثابت ہوتا ہے، کتابا متشابہا مثانی۔ (جز ۲)
 (ج) قرآن میں حکم اور متشابہ دونوں قسم کی آیتیں موجود ہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل آیت اشارہ کرتی ہے: —

مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ — (جز ۳)

آخر الذکر قول (ج) صواب اور مختار ہے۔ اور پہلے اور دوسرے اقوال میں جن آیتوں سے تمام قرآن کا حکم ہونا یا تمام قرآن کا متشابہ ثابت کیا گیا ہے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ حکم سے مراد یہ ہے کہ قرآن میں کسی طرح کا آیتوں میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے اور نہ اس میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش ہے اور متشابہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں حق و صداقت میں معجزہ ہونے میں باہم ایک دوسرے کے متشابہ ہیں —

(فوز البعیر، اتقان لمخص، از پروفیسر لطفی)



عہد صحابہ میں قرآن کے اصول

مفسر اسلام احمد امین مصری اپنی علی کتاب 'فجر الاسلام' میں لکھتے ہیں:-

قرآن عربی زبان میں عربوں کے اسلوب کلام کے مطابق ہوا تھا، اس کے تمام الفاظ عربی ہیں باستثناء ان قلیل التعداد الفاظ کے جو غیر عربی یعنی دوسری زبانوں سے لئے گئے تھے لیکن عربوں نے انہیں اپنالیا تھا اور ان پر اپنے قواعد جاری کر دیئے تھے قرآن کا اسلوب بیان خالص عربی اسلوب ہے اس میں حقیقت و مجاز اور کنایہ وغیرہ سب ہی موجود ہیں اور یہ سب چیزیں اسی طریقے سے استعمال ہوئی ہیں جس طرح عرب انہیں استعمال کرتے تھے یہ بات بالکل فطری ہے کیونکہ قرآن اذلاً عربوں ہی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے آیا تھا لہذا ضروری تھا کہ وہ ایسی زبان میں ہوتا جسے عرب کے لوگ سمجھ سکتے :-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ — اور ہم نے تمام رسولوں کو ان کی قوم کی زبان ہی میں بھیجا تھا تاکہ وہ ان کے سامنے خدا کی احکام کو پیش کر سکیں —

پورا قرآن ہر صحابی کی ذہنی اور عقلی گرفت میں نہیں آسکتا تھا

اس کے باوجود (یہ حقیقت ہے کہ) قرآن تمام صحابہ کی ذہنی اور عقلی گرفت سے باہر تھا یعنی سب میں یہ اہلیت نہیں تھی کہ وہ سارے قرآن کو اجمالاً اور تفصیلاً ایک مرتبہ سن لینے کے بعد فوراً سمجھ سکیں، ابن خلدون کا یہ قول صحیح نہیں ہے کہ قرآن عربوں کی زبان میں ان کی بلاغت کے اسلوبوں کے مطابق نازل ہوا تھا اور وہ سب کے سب اسے سمجھتے اور اس کے مفردات اور ترکیبات میں اس کی معانی و مطالب کو جانتے تھے۔ کیونکہ عربی زبان میں قرآن کا نازل ہونا اس امر کا متقاضی نہیں کہ عرب کے تمام آدمی قرآن کو اس کے مفردات اور ترکیبات کے ساتھ سمجھ سکتے ہوں، اس کی دلیل ہمارا رد و زمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ہر کتاب جو کسی زبان میں لکھی گئی ہو ضروری نہیں کہ اس زبان والے سب کے سب اسے سمجھ سکیں۔ کتنی انگریزی اور فرانسیسی کتابیں ہیں جنہیں انگریز اور فرانسیسی بھی خود نہیں سمجھ سکتے، کیونکہ کسی کتاب کا سمجھنا صرف اس زبان کے جاننے پر موقوف نہیں ہوتا جس میں وہ کتاب لکھی گئی ہے بلکہ اس کے لئے ایک خاص عقلی درجہ کی ضرورت ہوتی ہے کہ پڑھنے والوں کی عقل کا درجہ اور اس کتاب کا درجہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو۔ قرآن کے سامنے یہی حالت عربوں کی تھی وہ سب کے سب قرآن کو اجمالاً اور تفصیلی طور پر سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے عقلی درجے کے مطابق قرآن کو سمجھنے کے سلسلہ میں مختلف مدارج پر تھے، قرآن کے تمام الفاظ کے معانی بھی عرب کے سارے باشندے نہیں سمجھتے تھے، کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی قوم کا ہر فرد اپنی زبان کے سارے الفاظ کو سمجھ سکتا ہے اس دعویٰ کے ثبوت میں ہمارے لئے وہ روایت کافی ہے جو انس بن مالک نے بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمر بن الخطاب سے قرآن کی آیت "وَفَاكِهَةً وَ آبًا" کے متعلق پوچھا کہ اب سے کیا مراد ہے حضرت عمر نے فرمایا کہ ہمیں تکلف اور تمق سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ ہی سے روایت ہے کہ وہ نمبر پڑھ کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے

دوران تقریر میں یہ آیت پڑھی "أَوْ يَأْخُذْهُ عَلَى خَوْفٍ" پھر انہوں نے لوگوں سے خَوْف کے معنی پوچھے۔ بنو ہذیل کے ایک آدمی نے بتایا کہ ہمارے ہاں خَوْف کے معنی کم کرتے رہنے اور گھسنے کے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ دین اور علم میں حضرت علم کا رتبہ کیا تھا مگر انہیں بھی قرآن کے بعض آیت کے معانی دوسرے صحابہ سے پوچھنے پڑتے تھے، اسی سے دوسرے صحابہ کا اندازہ کر لیجئے، اکثر صحابہ آیت کے اجمالی معنوں پر اکتفا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کی آیت وَفَاكِهَةً وَأَبَابًا میں وہ اتنا سمجھ لینے پر اکتفا کرتے تھے کہ اس آیت میں خدا کی نعمتیں شمار کی گئی ہیں وہ اپنے نفسوں پر اس بات کو لازم نہیں سمجھتے تھے کہ وہ تمام آیات کے تفصیلی معانی کو سمجھیں۔

مزید برآں قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے سمجھنے کے لئے محض زبان کے الفاظ اور ان کے اسلوب کو سمجھنا کافی نہیں مثلاً وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا وَالذَّارِيَاتِ ذُرُوءًا کے معانی اور یہ کہ وَالْفُجْرُ وَلِيَالٍ عَشِيٍّ میں دس راتوں سے کیا مراد ہے؟ اور لَيْلَةُ الْقَدْرِ سے کیا مراد ہے؟ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ اس میں بہت سے اشیا کے ان چیزوں کی طرف ہیں جن کا ذکر نورات اور انجیل میں آیا ہے اور ان کی تردید مقصود ہے۔ ان آیات کو سمجھنے کے لئے محض زبان جاننا کافی نہیں حق تعالیٰ تو فرماتے

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ فَمَا يَخْلُكُوا وَبِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ..... (الآیہ) —

(خدا وہ ہے جس نے اے پیغمبر اسلام! تم پر کتاب نازل کی ہے اس کی کچھ آیات محکمات ہیں اور وہی کتاب کا اصل الاصول ہیں۔ اور دوسری آیات ملتی جلتی سی ہیں جن لوگوں کے دلوں میں گج ہے وہ فتنہ کی خواہش اور ان کا مطلب متعین کرنے کی خاطر ان ملتی جلتی آیات کے پیچھے لگ جاتے ہیں حالانکہ ان کا مطلب خدا اور انجیل فی العلم کے ہوا کوئی نہیں مانتا۔)

واقعہ یہ ہے کہ یہ بالکل سیدھی بات ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کو سمجھنے کی قدرت اور اس کے معانی و مطالب کی معرفت میں بڑا افتاد رکھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پورے قرآن کو حفظ کرنے کا رواج نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر ہوا اس زمانہ میں لوگ ایک سورت یا چند آیات یاد کر لیا کرتے اور ان کے مطالب و معانی کو سمجھ لیا کرتے تھے جب انہیں اس میں بہارت حاصل ہو جاتی تو آگے بڑھتے اور اس طرح کچھ اور سورتیں سمجھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح قرآن کریم کا حفظ صحابہ پر منقسم تھا۔ ابو عبد الرحمن سلمیٰ کا بیان ہے کہ ہم سے ان لوگوں نے بیان کیا ہے جو قرآن کریم کو پڑھتے تھے (جیسے حضرت عثمان بن عفان اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما وغیرہ) کہ جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ آیتیں پڑھ لیتے تھے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک علم و عمل کی وہ باتیں جان نہ لیں جو ان آیات میں ہوتی تھیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی سورۃ بقرہ اور آل عمران پڑھ لیا کرتا تھا تو ہماری نگاہوں میں اس کی عزت بہت بڑھ جایا کرتی تھی۔ (یہ روایت ام احمدؓ نے مسند میں بیان کی ہے) حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کو صرف سورۃ بقرہ کو یاد کرنے میں آٹھ سال لگ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عمرؓ اس طرح حفظ کرتے تھے کہ جب تک اچھی طرح سمجھ نہیں لیتے تھے ایک آیت سے دوسری آیت کی طرف منتقل نہیں ہوتے تھے۔

قرآن کریم میں بہت سی آیات محکم اور واضح المعنی ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا اصول دین اور اصول احکام سے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ یہی آیتیں جو اصول دین کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ جیسے سورۃ النعام وغیرہ۔ اس قسم کی آیات کو مجہوہ عوام سمجھ سکتے ہیں خصوصیت کے ساتھ

وہ لوگ جو اپنے سلیقہ کے اعتبار سے عرب ہوں۔ قرآن کریم میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے معانی دقیق ہیں۔ انہی آیات کو متشابہ کہا گیا ہے، ان کو سمجھنا دشوار ہے، ان کو سمجھنا خاص لوگوں ہی کا کام ہوتا ہے۔ صحابہؓ کو عموماً قرآن کو سمجھنے کی زیادہ قدرت تھی۔

کیونکہ قرآن ان کی زبان میں نازل ہوا تھا اور انہوں نے حالات کا مشاہدہ کیا تھا جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ اس کے باوجود قرآن کو سمجھنے کے اسباب و ذرائع سب کو بحال حاصل نہیں تھے یعنی

(۱) — عربی زبان کو جاننے میں ان میں باہم تفادات تھا، اگرچہ عربی ان سب کی زبان تھی مگر ان میں کچھ تو ایسے لوگ تھے جو ادبِ عالی کے اچھے عالم تھے اور غریب الفاظ کو جانتے تھے اور اس طرح قرآن کے مفردات کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے تھے۔ ان میں سے دوسرے وہ صحابہؓ تھے جنہیں یہ مواقع حاصل نہیں تھے، اسبابِ نزول کی معرفت آیت کا مقصود سمجھنے میں بڑی مددگار ہوتی ہے اور ان اسباب سے ناواقفیت بسا اوقات انسان کو غلطی میں ڈال دیتی ہے۔ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو بھرنے کا گورز بنایا تو جبارؓ نے حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قدامہؓ نے شراب پی ہے اور انہیں نشہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا گواہ کون ہے؟ جبارؓ نے کہا کہ میرے اس بیان پر ابوہریرہؓ شہادت دیں گے، حضرت عمرؓ نے کہا، اے قدامہؓ! میں تمہارے کوڑے ماروں گا۔ اس پر قدامہؓ نے کہا کہ خدا کی قسم جبکہ یہ لوگ کہہ رہے ہیں، اگر میں نے شراب پی بھی ہے تب بھی آپ کو یہ حق نہیں کہ آپ میرے کوڑے ماریں حضرت عمرؓ نے کہا کہ کیوں؟ — قدامہؓ نے کہا اس لئے کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: —

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ شَوْا لَتَقُوا وَاحْسَنُوا

(۱) ان پر کوئی مضائقہ نہیں ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اگر وہ کچھ لیں لیں جبکہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر رہے ہوں اور ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں، پھر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کریں اور ایمان لائیں۔ پھر قانونِ خداوندی کی حفاظت نگہداشت اور حسن کارنامہ کام کریں۔

(القرآن الحکیم)

”اور میں انہی لوگوں میں سے ہوں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، پھر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کی اور ایمان لائے اور نیک اعمال کئے، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ بدر، جنگِ اُمد، اور جنگِ خندق اور تمام غزوات میں شریک رہا ہوں۔“ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کوئی شخص ان کو جواب کیوں نہیں دیتا؟ تو ابن عباسؓ نے کہا کہ یہ آیتیں ان لوگوں کے عذر کے طور پر نازل ہوئی تھیں جن کا شراب کی حرمت نازل ہونے سے پہلے انتقال ہو چکا تھا اور باقی لوگوں پر جہت ہیں۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنصَابُ وَالْأَسْطُكَانُ هُنَّ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلٍ الشَّيْطَانِ

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! دافع رہے کہ شراب، خوار، بھوسے، چڑھاؤ اور پانے سب کے سب گندہ چیزیں اور شیطان کا کام ہیں۔

(القرآن الحکیم)

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابن عباسؓ، تم نے سچ کہا۔ ایک آدمی ابن مسعودؓ کے پاس آکر کہنے لگا کہ مسجد میں ایک آدمی قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کر رہا ہے۔ وہ اس آیت ”يَوْمَ نَسُفُ السَّمَاءَ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ“ کی تفسیر میں کہہ رہا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے سامنے ایک دھواں آئے گا جس سے اُن کے سانس گھٹ جائیں گے حتیٰ کہ انہیں زکام سا ہو جائے گا، اس پر ابن مسعودؓ

نے فرمایا کہ کسی کو کچھ معلوم ہو تو وہ بیان کرنا چاہیے، لیکن جسے معلوم نہ ہو اسے کہہ دینا چاہیے کہ خدا زیادہ جاننے والا ہے۔ اس آیت کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ قریش نے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی تو آپ نے انہیں سالہائے یوسف کی طرح کے قوط زدہ سالوں کی بد عمار دی۔ چنانچہ انہیں قحط اور مشقت نے آپ کو بڑا حتیٰ کہ وہ بڑیاں کھانے پر مجبور ہوئے۔ ان دنوں کی بات ہے کہ آدمی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تھا تو اسے جھوک کی مشقت کی بنا پر اپنے آسمان کے درمیان بجز ایک دھوئیں کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ (۲) عربوں کے گفتار و کردار میں ان کی عادتوں کو جاننے میں بھی اختلاف تھا۔ جو لوگ (مثلاً) زمانہ جاہلیت میں عربوں کے حج کی عادات و رسوم کو جانتے تھے، وہ بہ نسبت ان لوگوں کے جو ان کی عادات کو نہیں جانتے تھے حج کی آیات کو زیادہ سمجھ سکتے تھے، یہی حال ان آیتوں کا ہے جو عربوں کے دیوتاؤں اور دیولیوں اور عربوں کے طریقہ عبادت کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں کہ ان کو مکمل طور پر وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو جانتے تھے کہ عرب کے لوگ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔

(۳) قرآنی آیات کے نازل ہونے کے زمانہ میں جزیرہ عرب میں یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے، ان کا جاننا بھی ضروری ہے، کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں انہی کے اعمال کی طرف اشارہ ہے اور انہی پر رد کیا گیا ہے۔ ان آیات کو اس وقت تک سمجھنا بہت ہی دشوار ہے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ یہود و نصاریٰ کیا کچھ کیا کرتے تھے۔ نیز صحابہ کے درمیان فہم و بصیرت کے لحاظ سے بھی بہت تفاوت ہوتا تھا اور تابعین اور تابعین کے بعد کے لوگوں میں یہ تفاوت اور شدید ہو گیا تھا۔

سرچشمہ ہائے تفسیر یہاں تفسیر سے مراد بالمنقول ہے جس سے علماء کی مراد اذلاً وہ تفسیر ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی گئی ہے مثلاً حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ اَلصَّلَاةُ الْاَوَّلٰی اَلْاَوْثَمُ اے مراد نماز عصر ہے یا حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یَوْمُ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا کہ یوم النحر مراد ہے۔ یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خسر سے معاہدہ کر کے کونسی مدت کو پورا کیا تھا (آٹھ سال یا دس سال)۔

تفسیر بالروایت آپ نے فرمایا کہ وہ مدت پوری کی تھی جس میں پوری پوری ادائیگی اور وسعت تھی۔ (یعنی دس سال کی مدت) اس طرح کی بہت سی روایات ہیں جو صحاح ستہ کی کتابوں میں منقول ہیں۔ ان روایات میں قصہ گو لوگوں اور روایات گھڑنے والوں نے بہت کچھ اضافہ بھی کئے ہیں، علمائے حدیث ان پر تنقید کی ہے۔ کچھ روایات کو انہوں نے صحیح اور کچھ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اس امر کی دلیل کہ اس باب میں موضوع روایات بہت داخل ہوئی ہیں یہ ہے کہ ایک ہی آیت کی تفسیر میں دو دو متناقض تفسیریں نقل کی گئی ہیں جو ناممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہوئی ہوں۔ مثلاً حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اَلْقَنَا حَبِیْرًا لِّمُقَنْطَرَةٍ مِّنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ قطار ایک ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں۔ مگر دوسری طرف ابو ہریرہؓ سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطار بارہ ہزار اوقیہ کو کہتے ہیں۔ بلکہ اس بنا پر بعض علماء نے دوسرے سے اس باب کا انکار ہی کر دیا ہے، یعنی انہوں نے ان روایات کی صحت ہی کا جو محدثین اس باب میں بیان کرتے ہیں سب سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبلؓ سے روایات ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ تین باتوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔ تفسیر، ملاحم، اور مغازی۔ اس بات کی دلیل کہ خود مفسرین نے اس باب میں نقل شدہ

۱۵ موافقات صفحہ ۲۰۱ ج ۳ وابلد ۵۲ پہلی حدیث کو حکم نے اور دوسری حدیث کو احمد اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے۔ بابۃ الحوض

روایات پر اعتماد نہیں کیا یہ ہے کہ وہ ان تفسیروں پر رُک کر کھڑے نہیں ہو گئے جو روایات کے ذریعہ سے ان تک پہنچی تھیں بلکہ اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہ تفسیریں بیان کی ہیں جن تک انہیں خود ان کے اجتہاد نے پہنچایا تھا۔ اگر روایات کی تفسیریں ان کے نزدیک صحیح ہوئیں تو نص کے ذریعہ ایک تفسیر معلوم ہو جانے کے بعد ان کو بٹھہر جانا چاہیے تھا اور خود اپنی رائے سے کوئی تفسیر بیان کرنے کی جرأت نہ کرنی چاہیے تھی مگر مفسرین نے ایسا نہیں کیا۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا منقولی تفسیر کا یہ مجموعہ صحیح ہوتا چلا گیا بعد میں اس مجموعہ میں وہ تفسیریں بھی شامل ہو گئیں جو صحابہ تابعین اور دوسرے آئمہ سے منقول تھیں۔ حتیٰ کہ ابتدائی زمانہ کی تمام تفسیر کی کتابیں اسی پنج پر مرتب کی گئی ہیں۔

(دوم) اجتہاد بھی تفسیر کے حشموں میں سے ہے۔ اسے آپ "رائے" بھی کہہ سکتے ہیں۔ مفسر

تفسیر بالرائے | عربوں کے اسلوب بیان سے واقف ہو عربی الفاظ اور ان کے معانی کو نہ جانتا ہو۔ اسے یہ معلوم ہو کہ الفاظ جاہلی اشعار وغیرہ میں کہاں کہاں اور کس کس انداز سے استعمال ہوئے ہیں۔ صحیح اسناد کے ساتھ آیات کے اسباب نزول کے بارہ میں جو روایات پائی جاتی ہیں اسے ان کا بھی علم ہو۔ ان تمام اسباب کے ہتیا ہو جانے کے بعد وہ اپنے اجتہاد سے قرآنی آیات کی تفسیر کرتا ہو زیادہ تر صحابہ اسی طریق سے قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے، چنانچہ ابن عباسؓ اور ابن مسعودؓ جو تفسیریں منقول ہیں وہ اسی قسم کی تفسیریں ہیں، مثال کے طور پر آپ دیکھئے کہ آیت "وَإِذَا أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الصُّورَ" کی تفسیر میں مفسرین نے الصُّور کے لفظ کی مختلف تفسیریں کی ہیں۔ چنانچہ مجاہد نے الصُّور کی تفسیر مطلقاً پہاڑ سے کی ہے، لیکن ابن عباسؓ نے ایک خاص پہاڑ کے ساتھ کی ہے۔ دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ الصُّور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگا ہوا ہو۔ وہ کہتے ہیں۔ وہ خشک اور نئے پہاڑوں کو الصُّور نہیں کہتے۔ آپ نے دیکھا کہ تفسیروں کا یہ اختلاف دراصل رائے میں اختلاف کا نتیجہ ہے منقولات میں اختلافات کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ الفاظ کے معانی میں اختلاف کا آپ نے یہ ایک نمونہ دیکھا ہے۔ اسی طرح یہ حضرات آیات کے مطالب بیان کرنے میں بھی مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

تفسیر بالرائے کے متعلق صحابہ کے مختلف نظریات | یہ ضرور ہے کہ صحابہ اور تابعین دو گروں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں ایک گروہ ایسا بھی موجود تھا

جو قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہنے سے احتراز کرتا تھا، چنانچہ سعید بن المسیبؓ کے متعلق نقل کیا جاتا ہے کہ جب ان قرآن کے متعلق پوچھا جاتا تو فرمادیا کرتے "میں قرآن کے بارے میں کچھ نہیں کہتا" ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ میں نے عبیدہ سے قرآن کی کوئی بات کوہاتھ سے نہ دے، وہ لوگ گزر گئے جنہیں معلوم تھا کہ قرآن کن کن حالات و ظروف میں نازل ہوا تھا۔

"ہشام بن عروہ ابن الزبیر سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ "میں نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کی کسی آیت کا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا ہو" لیکن ان کے پہلو پر پہلہ وہ حضرات بھی تھے جو اسے جائز سمجھتے تھے اور ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، اور عکرمہؓ وغیرہ کی رائے یہی تھی۔ البتہ یہ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس بات کو بڑا سمجھتے تھے کہ صلاحت اور اسباب نہ رکھتے ہوئے کوئی شخص قرآن کی تفسیر بیان کرنے کی جرأت کرے، مثلاً کسی شخص کو عربی زبان کی اتنی معرفت حاصل نہیں ہے کہ وہ بات کو صحیح طور پر سمجھ سکے یا اس نے قرآن کو اس انداز سے نہیں پڑھا کہ اس کی محفل چیزوں کو مفصل چیزوں پر محمول کر سکے۔ ایسے

۲۱۱ صفحہ ۲۰۲۔ بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمدؒ کے شاگردوں میں سے محققین نے کہا ہے کہ امام صاحب کا مطلب ہے کہ ان میں سے زیادہ تر روایتوں کی صحیح اور مستقل سندیں نہیں تھیں۔

لوگوں کو تفسیر قرآن کی جرأت نہیں کرنی چاہیے ایسے ہی وہ اسے بھی بڑا سمجھتے تھے کہ کوئی شخص دینی مذاہب میں سے کسی خاص مسلک کا پیرو ہو جائے مثلاً اعتزال، ارجاء، تشیع وغیرہ اور پھر اپنے اس عقیدہ کو اصل قرار دے کر قرآن کی تفسیر اس کے مطابق کرنے لگے، مالا نکر ضروری ہے کہ عقیدہ کو قرآن کے تابع رکھا جائے، یہ نہیں کہ قرآن کو اپنے تابع کر دیا جائے۔

یہ اجتہاد ہی تھا جو صحابہؓ اور تابعینؓ کے درمیان الفاظ اور آیات قرآنیہ کی تفسیر میں واضح اختلافات کا موجب بن گیا جس کا مظاہرہ آپ کو ابن جریر طبری کی تفسیر کے قریب قریب ہر صفحہ پر نظر آسکتا ہے۔

جاہلی ادب شعر میں ہو یا نثر میں، جاہلیت میں اور ابتداء اسلام میں عربوں کے عادات اور ان کے رسم و رواج حوادث و واقعات جو عربوں کو پیش آئے وہ عداوتیں، منازعتیں، ہجرت، جنگ اور فتنے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آئے۔ وہ واقعات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران میں اور آیات قرآنی کے نزول کا موجب بنے، غرضیکہ یہ تمام چیزیں علمائے صحابہؓ اور تابعینؓ کے لئے وہ سرچشمہ تھیں جن سے وہ قرآن کی تفسیر پر قدرت حاصل کرنے میں مدد لیتے تھے۔

اسرائیلیات | تفسیر کے چشموں میں ایک اور سرچشمہ بھی تھا جس سے مفسرین نے بحیرت مدلی ہے۔ بات یہ ہے کہ عقول کے شغف اور مکمل معلومات حاصل کرنے کے شوق نے لوگوں کو قرآن کی بہت سی باتوں کو سننے کے بعد اس طرف دعوت دی کہ وہ اپنے اس پاس کے لوگوں سے ان کے متعلق سوالات کریں۔ چنانچہ جب انہوں نے اصحاب کہف کے کتے کا ذکر سنا تو کہنے لگے... اس کا کیا رنگ تھا؟ جب انہوں نے فَخَلْنَا صُبْرًا بَدُؤًا بَعْضُهُمْ سُنَّا تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ بعض کونسا حصہ تھا جس سے مقتول کی میت کو چھو ا گیا تھا؟ نوح علیہ السلام کی کشتی کتنی بڑی تھی؟ اس لڑکے کا کیا نام تھا جسے ایک نیک بندہ نے موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں قتل کر دیا تھا؟ جب ان کے سامنے فَخَذُ اسْرَ بَعَثَ مِنْ الصَّالِبِ بڑھایا جاتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ ان پندوں کی انواع کیا تھیں؟ وہ ستارے کون سے تھے جنہیں یوسف علیہ السلام نے اپنے خواب میں دیکھا تھا؟ ایسے ہی جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اُن کے سر کے قصہ میں قرآنی آیات سننے تھے کہ دونوں مدتوں میں موسیٰ علیہ السلام نے کونسی مدت پوری کی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے ان کی چھوٹی صاحبزادی سے شادی کی تھی یا بڑی سے؟ اسی طرح جب انہیں قرآن کریم میں ابتداء آفرینش کا کوئی اشارہ ملتا تھا تو باقی قصہ کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے تھے ایسے ہی جب ان کے سامنے کوئی ایسی آیت آتی تھی جس میں کسی نبی کے متعلق کسی حادثہ کا بیان ہوا تھا تو وہ اس حادثہ کی تفصیلات کے پیچھے پڑ جاتے تھے، جو چیز لوگوں کی اس علمی طبع کو پورا کر سکتی اور ان کی تشنگی کو فرو کر سکتی تھی وہ محض تورات اور اس کے متعلقہ صحابی اور شرح ہی ہو سکتی تھیں۔ بلکہ وہ افسانے اور کہانیاں بھی جو اس سلسلہ میں گھڑی گئی تھیں، مجھے یہودی مسلمان ہو چکے تھے ان کے ذریعے نامحسوس طریقہ پر یہ تمام معلومات مسلمانوں میں گھسٹی چلی آئیں اور قرآن کی تفسیر میں داخل ہوتی چلی گئیں، اس میں بعض صحابہؓ نے بھی کوئی مضافتہ نہیں سمجھا کیونکہ اپنے خیال میں اس طرح تو وہ قرآن کی شرح و توضیح کو مکمل کر رہے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب تم سے اہل کتاب کوئی بات بیان کریں تو نہ اس کو سچ سمجھو نہ جھوٹ، لیکن بعض حضرات کا عمل اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ حضرات ان کی باتوں کو سچ سمجھتے اور ان سے نقل کرتے تھے۔ اس کے نمونہ کے طور پر تمہارا جی چاہے تو طبری وغیرہ کی ان روایات کو پڑھ جاؤ جو انہوں نے قرآنی آیات ھَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلُلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ ذِكْرًا تفسیر میں

بڑے بڑے صحابہؓ نے اسرائیلیات کو بیان کرنے میں باک نہیں کیا،

بیان کی ہیں۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ کعب الاحبارؓ کے پاس اُٹھتے بیٹھتے اور اُن سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ اس بارہ میں مجھے ابن خلدون کا یہ قول بہت ہی پسند ہے کہ ”عرب اہل کتاب اور اہل علم نہیں تھے، ان پر بدویت اور امیت کا غلبہ تھا، جب انہیں کسی ایسی بات جاننے کا شوق ہوتا جن کا نفوس بشریہ کو شوق ہو جایا کرتا ہے مثلاً تکوین کے اسباب، ابتداء آفرینش اور وجود کے اسرار وغیرہ تو وہ اہل کتاب ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، یہ لوگ یہود میں سے اہل تورات تھے۔ اور ان کے بعد نصاریٰ تھے، اہل تورات جو ان عربوں کے درمیان میں رہتے تھے وہ بھی ان کی طرح کے بدوی تھے، انہیں اس قسم کی کچھ زیادہ باتیں معلوم نہیں تھیں، وہ اتنا ہی جانتے تھے جتنا عام اہل کتاب جانتے تھے ان کا بڑا حصہ بنو عمیرہ پر مشتمل تھا جنہوں نے یہودیت کو بطور اپنے دین کے قبول کر لیا تھا، یہ لوگ جب مسلمان ہوئے تو اپنی ان تمام داستانوں اور کہانیوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے جن کا احکام شرعیہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کہ اس میں وہ خاص احتیاط برتتے۔ مثلاً ابتداء آفرینش انتہا دُنیا اور ملام وغیرہ۔ یہ لوگ کعب الاحبار، وہب بن منبہ، اور ان جیسے دوسرے لوگ تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں تفسیر کی کتابیں ان منقولات سے بھر گئیں، جو ان نو مسلم یہودیوں نے ان سے بیان کی تھیں، ان کا تعلق چونکہ احکام سے تو تھا انہیں کہ ان کی صحت کی جانچ پڑتال سختی سے کی جانی کیونکہ احکام پر تو عمل کرنا واجب ہوتا ہے اور ان منقولات کا عمل سے کوئی تعلق نہیں تھا، لہذا مفسرین نے ان جیسی چیزوں کے نقل کرنے میں کافی تساہل سے کام لیا اور اپنی تفسیر کی کتابیں اس قسم کی خرافات سے بھر کر رکھ دیں۔“ (مقدمہ ص ۳۶)

نیز ابو طفیل کی یہ روایت دیکھئے کہ میں حضرت علیؑ کے ایک خطبہ میں حاضر تھا جس میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ: "تم مجھ سے کسی بات کے متعلق نہیں پوچھو گے مگر میں تمہیں اس کے متعلق بتا سکوں گا۔"

ان دونوں روایتوں کو نقل کر دیا

ہی غالباً کافی ہوگا، ان پر مزید کسی حاشیہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے اس کثرت سے روایات نقل کی گئی ہیں کہ ان کا شمار انہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ آیات قرآنی میں سے کوئی ایک آیت ایسی نہیں بچے گی جس میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک قول یا چند اقوال مروی نہ ہوں۔ راویوں نے اس کثرت سے روایات نقل کی ہیں کہ وہ حد سے متجاوز ہو گئی ہیں اور ناقدین کو بسلسلہ رواۃ کی تفتیش کرنی پڑی۔ چنانچہ کچھ سلسلوں کو انہوں نے معتبر اور کچھ کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ معاویہ ابن صالح، عن علی ابن ابی طلحہ، عن ابن عباسؓ سلسلہ اسناد ہے اس پر بخاریؒ نے بھی اعتماد کیا ہے جو میر عن سخاک عن ابن عباسؓ ناپسندیدہ سلسلہ اسناد ہے۔ ابن جریرؒ نے روایات کے جمع کرنے میں صحت کا اہتمام نہیں کیا ہر آیت کے متعلق جو کچھ انہیں بلا چاہے صحیح تھا اور چاہے ضعیف سب نقل کر دیا ہے۔ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباسؓ سب کے واہیات ترین سلسلہ اسناد ہے اگر اس کے ساتھ محمد بن مروان سدی صغیر کی روایت بھی مل جائے تو پھر تو وہ محض جھوٹ کا پلندہ ہے۔ وغیرہ ذالک۔۔۔۔۔ ابن عبدالحکم کی سند سے نقل کیا گیا ہے کہ میں نے امام شافعیؒ کو کہتے ہوئے سنا کہ ابن عباسؓ سے تفسیر میں سو حدیثوں کے لگ بھگ سے زیادہ ثابت نہیں ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حدیثیں گھڑنے والے کس قدر حدیثیں گھڑتے تھے اور حدیثیں گھڑنے کی حرکت کہاں تک پہنچ چکی تھیں۔

ان روایات کے گھڑے ہوئے ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ بعض اوقات آپ کو حضرت ابن عباسؓ کی ایسی وہ روایتیں ملیں گی جو خود حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہوں گی اور دونوں باہم متناقض ہوں گی کہ ان دونوں کو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب کرنا صحیح ہی نہیں ہو سکے گا۔ مثلاً ابن جریر طبری میں دیکھئے قرآن کی اس آیت کی تفسیر میں فَخَذْنَا مِنْهُمُ ابْنَةَ ابْنِ الْمَثَلِیْنِ فَصَنَعْنَا آلِیْنِکَ نِسْوَةً اُولٰٓئِکَ جَبَلْ مِنْهُمْ جِبْرًا شَقًّا اذْهَبْنِیْ یَا ثَمِیْمَکَ مَسْحًا۔ معاویہؓ نے علی ابن ابی طلحہ سے اور انہوں نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان چاروں پر بندوں کو کاٹ لو اور پھر ان کو دنیا کے چار کھونٹ میں رکھ دو، جو تھائی یہاں اور جو تھائی وہاں۔ پھر ان کو پکارو۔ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔۔۔۔۔ ذرا آگے چل کر ابن جریر کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن سعد نے حدیث بیان کی کہ میرے والد نے مجھ سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہہا کہ میرے چچا نے مجھ سے بیان کیا اور انہوں نے اپنے والد سے بیان کیا کہ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ فَصَنَعْنَا آلِیْنِکَ مِیْنِ صُنْیْهِیْنِ کی تفسیر یہ فرماتے ہیں کہ ان کو کاٹ ڈالو، اور دوسری جگہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان کو اچھی طرح باندھ لو، یہ بات تکلف کے ساتھ بھی کہنی مشکل ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے ایک وقت میں یہ تفسیر بیان کی ہو اور دوسرے وقت میں وہ اس کی مثال ابن جریر میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کی موضوع تفسیریں۔۔۔۔۔ حق بات تو بہر حال کہنی ہی پڑتی ہے۔ اپنی ایک علمی قیمت رکھتی ہیں جو تفسیر میں گھڑی جاتی تھیں وہ یونہی بے سرو پا باتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ اکثر اوقات یہ موضوع تفسیریں ذہین لوگوں کے اجتہاد کا علمی اور

اور قیمتی نتیجہ ہوتی تھیں۔ ان میں وہ چیز جس کی درحقیقت کوئی قیمت نہیں ہے صرف وہ اسناد ہے جس کے ذریعہ سے انہیں حضرت علیؑ یا ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جب ہم حضرت ابن عباسؓ وغیرہ سے منقول تفسیری روایات پر عام نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کا سرچشمہ وہی تین چیزیں ملتی ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کرچکے ہیں (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل، یا ان حوادث ووقائع کی روایت جو ان کے سامنے پیش آئے تھے جن سے کسی آیت کے معنی کی توضیح ہو جاتی ہو۔ (۲) ادب جاہلی پر اعتماد کرتے ہوئے فہم معنی میں اجتہاد اور عربی زبان اور عربوں کی عادات اور رسوم و رواج کی معرفت جو زمانہ جاہلیت اور ابتداء اسلام میں عام تھیں۔ اور (۳) اسرائیلیات اور ان کے عہد صحابہؓ کے بعد مذکورہ بالا صحابہؓ سے روایات کرنے میں بعض تابعینؓ نے خاص شہرت پائی۔ چنانچہ حضرت

مفسرین تابعینؓ ابن عباسؓ سے زیادہ ترجیح عطاء ابن ابی رباح۔ عکرمہ مولیٰ ابن عباس اور سعید ابن جبیر نقل کرتے ہیں۔ یہ چاروں حضرات ابن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے ان سے مکہ میں اکتساب علم کیا تھا اور سب کے سب موالیٰ میں سے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو حضرت ابن عباسؓ سے بکثرت روایات کرتے ہیں اور کچھ کم۔ مجاہد، حضرت ابن عباسؓ سے سب سے کم روایت کرتے ہیں اور یہی سب سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تفسیر پر امام شافعیؒ اور امام بخاریؒ وغیرہ جیسے اہل علم بھی اعتماد کرتے تھے لیکن بعض علماء ایسے بھی تھے جو مجاہد کی تفسیر کو قبول نہیں کرتے تھے چنانچہ ابن سعد نے اپنی طبقات میں نقل کیا ہے کہ اعمش سے پوچھا گیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ لوگ مجاہد کی تفسیر سے احتراز کرتے ہیں؟ اعمش نے بتایا کہ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ مجاہد تفسیر میں اہل کتاب سے پوچھا کرتے تھے اور ان کی باتیں نقل کیا کرتے تھے لیکن ہم نے یہ کسی کو نہیں دیکھا کہ اس نے مجاہد کے صدق و امانت پر طعن کیا ہو۔ اسی طرح عطاء ابن ابی رباح اور سعید ابن جبیر بھی قابل اعتماد اور بچے بزرگ تھے۔ وہ کئے عکرمہؓ تو وہ ابن عباسؓ سے سب سے زیادہ روایتیں نقل کرتے ہیں اور یہ ان کے آزاد کردہ غلام بھی ہیں۔ ان کی اصل مغرب میں برابر سے تھی۔ ان کو قابل اعتماد شمار کرنے میں علماء کا اختلاف ہے کچھ لوگ ان پر اعتماد کرتے اور نہ ان سے کوئی روایت نقل کرتے ہیں۔ امام بخاریؒ انہیں قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور ان سے روایت بھی کرتے ہیں دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ وہ علم میں بڑے جبرئی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قرآن میں وہ ہر چیز کو جانتے تھے۔ کسی شخص نے سعید بن المسیبؓ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کی کسی آیت کے متعلق نہ پوچھو، اس شخص سے پوچھو جو یہ سمجھتا ہے کہ اس پر قرآن کی کوئی بات متغی نہیں ہے۔ یعنی عکرمہؓ سے۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تفسیر میں عراق کے اندر مرق بن ابی الماجدؓ زیادہ مشہور ہیں۔ یہ عربی النسل ہیں اور قبیلہ ہمدان سے ان کا تعلق ہے، نہایت پرہیزگار، زاہد، ثقہ اور سچے آدمی تھے، کوفہ میں رہتے تھے اور شریح قاضی پیچیدہ معاملات و مسائل میں ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اسی طرح قتادہ ابن دعائمؓ سدوسی ائمہ کی بھی بڑی شہرت تھی یہ بھی عربی الاصل تھے اور بصرہ میں رہتے تھے۔ تفسیر میں ان کی شہرت عربی زبان پر ان کی قدرت و عبور کی وجہ سے تھی۔ اشعار پر ایام العرب اور انساب عرب پر ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں، قابل اعتبار بزرگ تھے تاہم کچھ لوگوں نے ان کی روایتیں بیان کرنے سے احتراز برتا ہے کیونکہ قضا و قدر کے مسائل میں غور و خوض کرتے تھے۔

اس عہد، یعنی تابعینؓ کے عہد میں اسرائیلیات اور نصرانیات کی وجہ سے تفسیر کا باب بہت ہی خیم ہو چکا تھا، کیونکہ یہودی اور نصرانی بکثرت اسلام میں داخل ہو چکے تھے،

لوگوں کو ان یہودی اور نصرانی حوادث و واقعات کی تفصیلات سننے کا شوق تھا جن کی طرف قرآن نے محض اشارہ کرنے پر اکتفا کیا تھا۔ ہم نے تفسیر ابن جریرؒ میں بہت سی ان آیتوں کو تلاش کیا ہے جو بنی اسرائیل کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکایک ہم دیکھتے ہیں۔

ان کی تفسیر میں ستر پادہ باطل روایات بیان ہوئی ہیں جن کا انحصار محض وہب بن منبہ ہی پر ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ وہب بن منبہ میں کے ایک یہودی تھے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ یہودی کتابوں اور ان کے قصوں کو بغیر ترقی احتیاط کے بیان کرتا ہے اور اپنی روایتوں کو علمی رنگ دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مسلمانوں نے ان روایتوں کو وہب بن منبہ سے لینے میں کافی تساہل برتا۔ جیسا کہ ابن خلدون نے اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کیونکہ ان روایات کے بیان کرنے پر ان کے خیال میں کسی حکم شرعی کا استنباط مرتب نہیں ہوتا تھا، جیسا کہ ہم نے بہت سی ان آیات کو تلاش کیا، جو نصاریٰ کے متعلق وارد ہوئی ہیں تو یکا یک ہم دیکھتے ہیں کہ طبری کی روایت روایات ابن جریر سے نقل کی گئی ہیں۔ یہ ابن جریر عبد الملک بن عبد العزیز بن جریر ہے۔ اہم ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں کہتا ہے کہ یہ رومی نژاد تھے، لہذا یہ نصرانی الاصل تھے، ان کے متعلق بعض علماء کہتے ہیں کہ وہ حدیثیں وضع کیا کرتا تھا، اس نے متعہ کے طریقے سے نوٹے عورتوں سے شادی کی تھی، کہا جاتا ہے کہ ابن جریر پہلا شخص تھا جس نے اسلام میں کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی پیدائش شام میں ہوئی۔ اور تقریباً ۱۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا، وہ بہت سے شہروں میں گھومے پھرے، ان کی پیدائش شام میں ہوئی اور بصرہ میں اور بغداد کی طرف سفر کیا۔ صحابہ اور کبار تابعین کے عہد کے بعد علماء نے تفسیر کی کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دی تھیں، مگر ان کا انداز ایک سا ہی ہوتا تھا۔ وہ ایک آیت بیان کرتے تھے اور اس کی تفسیر میں صحابہ اور تابعین سے جو کچھ نقل کیا جاتا تھا اسے سند کے ساتھ بیان کرتے تھے، جیسے تفسیر سفیان ابن عیینہ تفسیر دحیح ابن الجراح، تفسیر عبد الرزاق وغیرہ۔ ہم تک یہ تفسیریں نہیں پہنچ سکیں۔ ہم تک وہ تفسیریں پہنچی ہیں جو اس طبقہ کے بعد لوگوں نے تصنیف کیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔

اس کے بعد یہ بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر ہر زمانہ میں اپنے دور کی علمی حرکت سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ ہر زمانہ کی تفسیریں ان علمی آراء و نظریات اور مذہب دینیہ کا ایک عکس اور پرتو ہوتی ہیں۔ جو اس زمانہ میں رواج پذیر ہوتے تھے، ابن عباس سے لے کر استاد شیخ محمد عبدہ تک یہی چیز آپ کو نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ اگر آپ کسی خاص زمانہ میں تالیف شدہ تمام تفسیروں کو جمع کر لیں تو ان سے آپ اس علمی حرکت کی مقدار و ضاحت کے ساتھ تعین کر سکتے ہیں، جو اس زمانہ میں شائع اور مقبول تھیں اور ان کا بھی جو غیر مقبول تھیں۔ اگر آپ ان تفسیری روایات کو تلاش کریں جو صحابہ اور تابعین کے صدر اول کے لوگوں سے نقل کی جاتی تھیں تو آپ ان میں دیکھیں گے کہ وہ حضرات کسی آیت کی تفسیر میں مختصر الفاظ میں محض لغوی معنی کی توضیح پر اکتفا کرتے تھے جو انہوں نے آیت سے سمجھے ہیں۔ مثلاً غَابَرُ مَجَافٍ لِّشَوْءٍ کی تفسیر میں وہ کہیں گے: "کسی معصیت سے تعرض نہ کرنے والے" اور مثلاً حق تعالیٰ کے اس ارشاد: وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِاللَّهِ زَلَّامٌ کی تفسیر میں وہ بیان کریں گے کہ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی سفر میں باہر جانے کا ارادہ کرتا تو ایک تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر تو سفر کرنے کا حکم دیتا ہے، اگر تیر بھل آیا تو میرا سفر میں جانا ٹھیک ہے اور مجھے بھلائی حاصل ہوگی۔ اور ایک دوسرا تیر لیتا اور کہتا کہ یہ تیر سفر نہ کرنے کا حکم دیتا، اگر تیر بھل آیا تو مجھے سفر میں کوئی بھلائی نہیں ملے گی اور ایک تیر سادہ لے لیتا جس پر کوئی نشان نہیں ہوتا تھا، حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس فعل سے منع فرمایا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے تو آیت کا سبب نزول بیان کر دیتے تھے لیکن بعد کے مصنفین اور راویوں نے اس میں بڑی وسعت پیدا کر لی تھی، چنانچہ بے لگان یہود و نصاریٰ کی روایات بیان کی جانے لگی تھیں۔ لیکن اس دور میں بھی تفسیر میں ان لوگوں کی جانب سے آپ کو کہیں فقہی مسئلہ کے علمی استنباط کا نشان تک بھی نہیں ملے گا اور نہ ہی کسی دینی مسلک کی تائید۔ لیکن اس کے بعد کے زمانہ میں جبکہ تقدیر وغیرہ کے مسائل پر بحثیں ہونے لگی تھیں، آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کو دراصل یہ مذاہب ہی تفسیریں لکھنے پر راغب کرتے تھے ہر شخص اپنے مذہب و مسلک — جبر و اختیار وغیرہ کے مطابق تفسیریں کرنے لگا تھا پھر جب فقہی حرکت شاندار طریقہ پر شروع ہوئی تو آپ مفسرین فقہاء کو دیکھیں گے کہ وہ آیات کو بیان کرنے لگتے ہیں تو ان سے جو فقہی احکام مستنبط ہوتے ہیں، ان کو بھی ذکر کرتے جاتے ہیں، بالکل یہی کچھ قواعد نحو، قواعد بلاغت اور قواعد اخلاق کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے۔

چند تفسیری مباحث

تفسیر قرآن میں اختلاف کے اسباب

①

علامہ ابن تیمیہ اصول تفسیر میں فرماتے ہیں : -----
 ”سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو قرآن کے معانی و مطالب کی تعلیم دی جس طرح آپ نے ان تک اس (قرآن) کے الفاظ پہنچائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے قول لتبتین للناس مائزل الیہو میں الفاظ و مراد دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ابو عبد الرحمن السیسی کہا کرتے کہ جن صحابہ نے ہمیں قرآن کی تعلیم دی ہے مثلاً عثمان بن عفانؓ اور عبد اللہ بن مسعود وغیرہ، وہ (صحابہ) فرمایا کرتے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں سیکھ لیتے، تو جب تک وہ ان آیتوں کا علم و عمل مکمل نہ کر لیتے اُس وقت تک آگے نہ بڑھتے، اس کے بعد ابو عبد الرحمن کہتے کہ اسی طرح (صحابہ) ہم نے بھی قرآن اور علم و عمل سب سیکھا ہے۔“

پھر کون نہیں جانتا کہ ہر کلام سے مفصل و اس کے معانی کا بھجنا ہوتا ہے نہ کہ اس کے صرف الفاظ کا سُن لینا، پس قرآن تو سب سے بڑھ کر اس بات کا مستحق ہے کہ اس کے معانی و مطالب سمجھے جائیں، نیز الفاظ کے سُن لینے پر اکتفا کرنا عبادت کے بھی خلاف ہے مثلاً طب اور حساب وغیرہ کی کوئی کتاب پڑھی جائے تو کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی شرح و تفہیم نہ چاہتے ہوں، تو اللہ کی اُس کتاب کے ساتھ محض الفاظ ----- کے سُن لینے یا طوطے کی طرح رُٹ لینے کا طرز عمل کس طرح رُدا ہو سکتا ہے، جو مسلمانوں کے لئے (خرسان و نامرادی سے بچنے کی گویا) ڈھال ہے جس کے ساتھ ان کی سعادت و نجات وابستہ ہے اور جس پر ان کے دین و دنیا کے قیام کا دار و مدار ہے۔

صحابہؓ کے درمیان تفسیر قرآن کے باب میں بہت کم اختلاف تھا، اور وہ اگرچہ تابعین میں برنسبت صحابہؓ کے زیادہ تھا، مگر ان کے بعد والوں کے لحاظ سے پھر بھی کم ہی تھا اور زمانہ جتنا بہتر ہوگا، اتفاق و یکجہتی اور علم و بیان کی کثرت ہے گی۔ بہت سے تابعین وہ ہیں جنہوں نے صحابہؓ سے پوری تفسیر حاصل کی، جیسا کہ مجاہد (متوفی ۱۰۱ھ) کا بیان ہے کہ میں نے ابن عباسؓ پر مصحف (قرآن) پیش کیا، ہر آیت پر اُن کو پُھر پُرا تا تھا اور اس آیت سے متعلق اُن سے پوچھتا تھا، اسی لئے امام توری نے فرمایا ہے، کہ جب تم کو مجاہد کے ذریعہ تفسیر پہنچے تو وہ تمہارے لئے کافی ہے اور اسی لئے ان کی تفسیر پر امام شافعیؒ اور بخاری وغیرہ اہل علم اعتماد کرتے ہیں اور اسی طرح امام احمدؒ وغیرہ جنہوں نے تفسیر میں کتاب تصنیف کی ہے، وہ دوسرے طریقوں کی برنسبت مجاہد سے زیادہ اخذ کرتے ہیں۔

غرض، تابعین نے صحابہ سے تفسیر بھی حاصل کی، جس طرح انہوں نے ان سے علم سنت حاصل کیا اگرچہ وہ اس

حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ علم کا سرچشمہ یا تو مستند نقل ہوتا ہے یا تحقیق شدہ استدلال — اور منقول یا تو رسولِ معصوم سے ہوگا یا کسی غیر معصوم سے —

تو قسم اول (منقولات) سے متعلق یا تو اس کے صحیح اور ضعیف ہونے کی معرفت ممکن ہوگی یا ممکن نہ ہوگی، اور منقول کی یہ دوسری قسم یعنی جس کی تصدیق کا کوئی یقینی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں، تو اس پر گفتگو اور بحث بے فائدہ اور فضول ہے، کیونکہ ایسا ممکن کئے لئے جس کا جاننا ضروری ہے، وہ ایسی چیز نہیں جو بے دلیل ہو یا جس کی صحت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو بلکہ اس کے حق ہونے پر اللہ کی طرف سے دلیل قائم ہو چکی ہے —

ایسی بے فائدہ چیز جس کی صحت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور اس کے باوجود اُسے موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، اس کی مثال مفسرین کا وہ اختلاف ہے جو اصحابِ کہف کے حالات کے بارے میں ہے یا یہ اختلاف کہ حضرت موسیٰ نے مذہبِ لوط کے جس حصّہ کو منقول کے جسم پر مارا تھا یا حضرت لوط کی کشتی کی لمبائی اور چوڑائی کے باب میں اختلاف اور یہ کہ اس کشتی کے تختے کس درخت کے تھے، یا اس لڑکے کے نام کے بارے میں اختلاف جس کو خضر نے قتل کیا تھا۔ وغیر ذلک —

کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ یہ اور ان جیسے امور کے علم کا ذریعہ نقل ہی ہے، تو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور سے منقول ہوگا اور جو معلوم ہے، وہ قابلِ قبول ہوگا جیسے یہ کہ حضرت موسیٰ کے رفیق سفر کا نام خضر تھا لیکن جو ایسا نہ ہوگا بلکہ اہل کتاب کے مانو ہوگا جیسے کعب اور وہب اور محمد بن اسحاق وغیرہم کی منقولات —

اسی طرح جو باتیں تابعین سے منقول ہیں، اگرچہ انہوں نے اس کا ذکر نہ کیا ہو کہ انہوں نے اہل کتاب سے لیا ہے اور جب تابعین باہم اختلاف کریں تو بعض کا قول بعض پر رجعت نہ ہوگا، لیکن اس بارے میں اگر صحابہ سے صحت کے ساتھ کچھ منقول ہو تو وہ کسی تابعی سے منقول ہونے کی بہ نسبت زیادہ قابلِ اطمینان ہوتا ہے، کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو یا ایسے کسی شخص سے سنا ہو جس پر انہیں پورا اعتماد ہو کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یقیناً سنا ہوگا۔

رہیں قسم اول کی وہ منقولات، جن کی صحت کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے، تو بحمد اللہ کہ وہ اتنی موجود ہیں جتنے کی ہمیں حاجت ہے غرض، تفسیر و حدیث اور غرض و ات میں بہت سے ایسے امور ملتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء صلوات اللہ علیہم اجمعین کی طرف منسوب ہیں لیکن نقلِ صحیح سے ان کا رد بھی کیا جاسکتا ہے، اگرچہ یہ انہی منقولات میں ملی جلی موجود ہیں جن کا سند نقل ہے اور جس کے بارے میں نقل کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی صحیح صورتِ حال کا پتہ چلایا جاسکتا ہے —

اب رہ جاتا ہے اختلافِ تفسیر کے اسباب میں سے دوسری قسم کا سبب، یعنی وہ جس میں ذریعہ علم استدلال ہوتا ہے نہ نقل۔ تو اس میں زیادہ تر غلطیاں دو جہتوں سے ہوئی ہیں اور صحابہ تابعین اور ان کے نقشبند قدم پر چلنے والے تبع تابعین کی تفاسیر کے بعد ہوئی ہیں کیونکہ وہ تفاسیر جن میں صرف انہی اسلاف (صحابہ، تابعین اور تبع تابعین) کا کلام ذکر کیا جاتا ہے، ان میں ان دو جہتوں کی قیید کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ جیسے تفسیر عبد الرزاق، تفسیر وکیع، تفسیر عبد بن حمید اور تفسیر عبد الرحمن بن ابراہیم اور جیسے تفسیر اسحاق بن راہویہ، تفسیر بقی بن مخلد، تفسیر بقی بن مخلد، تفسیر ابو بکر بن المنذر، تفسیر سفیان بن عیینہ، تفسیر السدی، تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن ابی عاصم، تفسیر ابو سعید الأشج، تفسیر ابو عبد اللہ بن ماجہ اور تفسیر ابن مردویہ —

متذکرہ بالا دو جہتوں پر عمل کرتے ہوئے تفسیر کرنے والے یہ دو گروہ ہیں —

ایک گروہ تو وہ ہے جس نے اپنے ذہن میں پہلے ہی سے ایک نظریہ قائم کر رکھا ہے، پھر قرآنی الفاظ کو بکھینچ کر اس

پر منطبق کرتا ہے اور دوسرا گردو ہے جس نے قرآن کی تفسیر محض اس امر کے ساتھ کی جس کو ایک عربی بولنے والا مراد لیتا ہے بغیر اس امر کا لحاظ کئے ہوئے کہ کس متکلم کا یہ قرآن ہے اور کس پر نازل ہوا ہے اور اس کے مخاطبین اول کیسے لوگ تھے۔ تو اول الذکر لوگوں نے تو صرف اس سطح نظر کی رعایت کی جسے پہلے ہی اذہان میں جمایا گیا تھا، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ قرآنی الفاظ اپنی دلالت و بیان کے اعتبار سے اُس نظریہ کے متحمل بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں جسے انہوں نے ذہنوں میں قائم کر رکھا ہے اور دوسرے حضرات نے محض الفاظ کی رعایت کی اور صرف یہ پیش نظر رکھا کہ اس سے ایک عرب کیا مراد لیتا ہے بغیر یہ لحاظ کئے ہوئے کہ قرآن کے متکلم کا مقصد اور سیاق کلام کیا ہے۔

پھر ان دنوں گردو ہوں میں سے اگرچہ اول الذکر کی نظر پہلے معنی کی طرف ہوتی ہے اور ثانی الذکر کی پہلے لفظ کی طرف ہوتی ہے، تاہم یہ ثانی الذکر لوگ اکثر لغوی طور پر لفظ کو اس معنی پر محمول کرنے میں ویسی ہی غلطی کر جاتے ہیں جیسی غلطی اس میں اول الذکر حضرات سے سرزد ہوتی ہے، اول الذکر حضرات اس معنی کی صحت میں جس کے ساتھ انہوں نے قرآن کی تفسیر کی ہے، ویسی ہی غلطی کر بیٹھتے ہیں جیسی غلطی ثانی الذکر گردو نے کی ہوتی ہے۔

پہلے گردو والے دو طرح کے لوگ ہیں کبھی تو وہ قرآنی الفاظ سے اس کے وہ مدلول و مراد سلب کر لیتے ہیں جو اُس کے مدلول و مراد ہیں اور کبھی وہ قرآنی الفاظ کو ایسے معنی پر محمول کرتے ہیں جس پر نہ لفظ کی دلالت ہوتی ہے اور نہ وہ مراد لیا جاسکتا ہے اور دونوں حالتوں میں کبھی وہ معنی برے سے باطل ہوتا ہے جسے نفی کی صورت میں یا اثبات کی صورت میں انہوں نے مراد لیا ہے تو وہ اس صورت میں دلیل اور مدلول دونوں میں وہ غلط کار ہوا کرتے ہیں اور کبھی وہ معنی برے سے باطل تو نہیں، بلکہ حق ہی ہوتا ہے اور ایسی صورت میں غلطی مدلول میں چاہے نہ ہو، مگر دلیل میں وہ برسر غلط ہوتے ہیں۔

پس جن لوگوں نے دلیل اور مدلول دونوں میں ٹھوکر کھائی ہے، مثلاً اہل بدعت کا گردو تو انہوں نے ایک ایسا مسک اختیار کر رکھا ہے جو اُس کے حق میں منافی ہے جس پر ائمہ و وسط فائزہ، جو کفر ای پر جمع نہیں ہو سکتی، جیسا کہ ائمہ سلف اور اُن کے ائمہ ہیں۔ ان اہل بدعت نے قرآن کو اپنا تختہ مشق اس طرح بنایا کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق کھینچ تان کر قرآن کی تاویل کرتے ہیں اور اس باب میں کبھی تو اپنے مسک کی تائید کے لئے آیات سے اس قدر دور اڑا کر استدلال کرتے ہیں کہ وہ (آیات) اس کی متحمل نہیں ہوتیں اور کبھی ایسا کرتے ہیں کہ اپنے مسک کے خلاف پڑنے والی آیات میں ایسی تاویل کرنے سے بھی ذریعہ نہیں کرتے جو تحریف کے شمار میں آتی ہے۔

غرض، مقصود یہ ہے کہ تفسیر قرآن کے باب میں ان (اہل بدعت) کی روش یہ ہے کہ انہوں نے ذہنوں میں جو ایک خود ساختہ رائے پہلے ہی سے جما رکھی ہے۔ قرآن کو اس پر چسپاں کرتے چلے گئے، حالانکہ ان کی رائے کی موافقت میں اور نہ ان کی تفسیر کی تائید میں صحابہ یا تابعین یا ائمہ مسلمین سے کوئی دلیل فراہم ہوتی ہے اور ان کی تفاسیر باطلہ میں سے کوئی ایسی تفسیر نہیں جس کا بطلان بہت سی دہو سے ظاہر نہ ہوتا ہو۔

ان تفاسیر کے بطلان کے ظاہر ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کی بیان کی ہوئی تفسیر کے غلط ہونے کا علم حاصل ہو جائے اور دوسری یہ کہ ان کی تفسیر یا تو اپنے باطل مسک پر دلیل بنتی ہو یا مد مقابل کے جواب میں بیان کی گئی ہو۔ پھر ان میں سے بعض ایسے ہیں جو عباد آرائی میں بد طولی رکھتے ہیں اور بڑی فصیح عبارت رکھتے ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے باطل عقائد کو اپنی تحریروں اس طرح چھپاتے ہیں کہ اکثر لوگ اس زہر کو نہیں معلوم کر سکتے۔ لہ۔ (حاشیہ نگار صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

پھر علامہ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ : —

” فلاسفہ، قرامطہ اور رافضیوں کا معاملہ تو اور زیادہ بڑھ گیا ہے، کیونکہ انہوں نے ایسے عجیب و غریب طریقوں سے قرآن کی تفسیر کی ہے کہ ناطقہ سر بگیاں ہے، اسے کیا کہیے، مثلاً تَبَّتْ يَدَا ابْنِ لَهْبَعٍ سے متعلق رافضیت کا یہ تفسیری شاہکار کہ اس (دونوں ہاتھ) سے مراد ابو بکرؓ و عمرؓ ہیں —“

حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہؓ و تابعینؓ کے مذاہب اور ان کی تفسیر سے تجاوز کر کے اس کے مخالف کو جو اختیار کرتا ہے، تو اس بارہ میں وہ خطا کار اور بدعتی سمجھا جائے گا، اگرچہ وہ اجتہاد کی راہ سے ایسا کرتا ہے، اور غلط اجتہاد اگرچہ عند اللہ قابل معافی ہوتا ہے، لیکن یہاں مقصود تو بتانا ہے کہ علم کے طریقے اور اس کے دلائل اور صواب کی روش کیا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کو صحابہؓ و تابعینؓ اور ان کے تابعین نے پڑھا تھا اور یہ کہ اس کی تفسیر اور اس کے معانی کو اس طرح سے زیادہ جانتے تھے جس طرح وہ اس حق کو سب سے بڑھ کر جانتے تھے جسے دے کر اللہ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرمایا تھا، لہذا جو شخص ان کے قول کی مخالفت کرتا ہے اور ان کی تفسیر قرآن کے علی الرغم تفسیر کرتا ہے تو وہ دلیل اور مدلول سب میں غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن سے مدلول میں نہیں بلکہ دلیل میں غلطی ہوئی، تو ان کی مثالیں صوفیاء اور واعظین فقہاء وغیرہم میں بہت ہیں کہ ان کی تفسیر قرآن معانی پر مشتمل ہونے کے باوجود ایسی ہوتی ہے کہ قرآنی الفاظ ان معانی پر دلالت نہیں کرتے، جن کی بحسرت مثالیں ابو عبد الرحمن سلمیٰ کی ”حقائق التفسیر“ میں ملتی ہیں۔ اور جب یہ لوگ اپنی تفسیر میں غلط معانی بھی بیان کرتے ہیں تو پھر وہ قسم اول کے لوگوں میں داخل ہو جاتے ہیں، یعنی وہ جو مدلول اور مدلول دونوں میں غلط کار ہیں، کیونکہ جو معنی ان کے نظر ہوتے ہیں وہ سرے سے فاسد ہوتے ہیں —“

(۲) — اصول تفسیر

پھر علامہ ابن تیمیہ اپنی مذکورہ کتاب میں تفسیر کے صحیح طریقے کی جانب اس طرح رہنمائی کرتے ہیں کہ :—

” تفسیر کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے، کیونکہ قرآن میں اکثر و بیشتر یہ بات ہے کہ اگر ایک جگہ اجمال سے کام لیا ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اور کہیں ابہام ہے تو دوسری جگہ اس کی تشریح و توضیح مل جاتی ہے اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو پھر سنت کی طرف رجوع کرو کیونکہ وہ قرآن کی شرح اور اس کی وضاحت کرتی ہے بلکہ امام شافعیؒ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ہر حکم قرآن کی تفسیر میں شامل ہے۔ اور جب تفسیر قرآن میں پہلے اور نہ سنت میں تو پھر ہمیں اقوال صحابہؓ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ وہی قرآن کی زندہ

۱۔ (حاشیہ گذشتہ صفحہ) اس دور میں پرویزی کا انداز تحریر ایسا ہے کہ وہ ادبی اسلوب میں سب کچھ کہہ جاتا ہے، ہمارے وہ نوجوان جن پر مغربی افکار کا غلبہ ہے ایسی ادبی تحریروں سے اپنے ایمان کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ (اسدی)۔ ۲۔ ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹیں۔ ۳۔ صرف دلیل میں غلطی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ معنی و مضمون (تفسیر) تو اپنی جگہ صحیح ہے لیکن قرآن کے الفاظ اس پر دلالت نہیں کرتے اور دلیل و مدلول دونوں میں غلطی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مفہوم بذات خود بھی ہے اور قرآن کے الفاظ بھی اس پر دلالت نہیں کرتے — (مترجم)

تفسیر (رسول کی زندگی) کے معنی شاہد ہیں اور ان احوال و ظروف اور اسباب سے بخوبی واقف تھے، جن میں قرآن کا نزول ہوا ہے نیز فہم نام کے مالک اور علم صحیح کے حامل تھے، خصوصاً ان کے علماء و اکابر مثلاً ائمہ اربعہ، یعنی خلفائے راشدین اور ہدایت یافتہ ائمہ جیسے عبداللہ بن مسعود وغیرہ۔ ابن جریر طبری نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ اس ذات کی قسم جس کے ہوا کوئی اللہ نہیں، کہ کوئی آیت کتاب اللہ کی ایسی نازل نہیں ہوئی ہے جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو کہ کس کے ہائے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی اور اگر میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوتا جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا عالم ہوتا اور اس کے پاس پہنچنے کے لئے سواری پر جایا جاسکتا تو میں ضرور اس کے پاس جاتا۔ نیز ابن مسعود سے روایت ہے کہ ہم میں سے جب کوئی شخص دس آیتیں سیکھ جاتا تو آگے نہیں بڑھتا تھا تا وقتیکہ ان کے معانی نہ جان لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا اور انہی ہدایت یافتہ ائمہ میں سے جبرائیل عبداللہ بن عباسؓ ہیں۔ چنانچہ ابن مسعود فرمایا کرتے کہ ابن عباسؓ کیا ہی خوب ترجمان القرآن ہیں۔

رہی یہ صورت کہ تفسیر قرآن میں ملے، نہ سنت میں اور نہ اقوال صحابہؓ میں، تو ایسی حالت میں اکثر ائمہ نے اقوال تابعینؓ کی طرف رجوع کیا ہے۔ مثلاً مجاہد بن جبرؓ کی طرف، چنانچہ محمد بن اسحاقؓ نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ مجاہد کہا کرتے کہ میں نے مصحف قرآن کا از ابتداء تا انتہا تین مرتبہ ابن عباسؓ سے اس طرح دیکھا ہے کہ ہر آیت پر انہیں ٹھہراتا اور اس کی بابت تشریح و تفسیر پوچھتا

اسی طرح دوسرے تابعینؓ میں مثلاً سعید بن جبیرؓ، عکرمہ مروزیؓ، ابن عباسؓ، عطاء بن ابی رباحؓ، حسن بصریؓ (متوفی ۱۱۰ھ)، مسروق بن ابی اجدعؓ (متوفی ۱۲۰ھ)، سعید بن المسیبؓ، ابو العالیہؓ (متوفی ۱۳۰ھ)، ربیع بن انسؓ (متوفی ۱۴۰ھ)، قتادہؓ اور ضحاک بن مزاحمؓ (متوفی ۱۵۰ھ) وغیرہم اور ان کے تبع تابعینؓ کے علماء تفسیر کہ یہ وہ طویل القدر علماء ہیں جن کے اقوال آیت کی تفسیر میں نقل کے بجائے تفسیر، لیکن مختلف الفاظ پر مشتمل ان کی عبارتیں دیکھ کر بے علم لوگ اس دہم پر مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ اس بناء پر ان اقوال کو اختلافات کا رنگ دے کر نقل کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، کیونکہ کوئی توجیز کے لازم یا نظیر کو بیان کرتا ہے اور کوئی بعینہ اس چیز کو۔ اس طرح الفاظ تو مختلف ہوتے ہیں مگر سب کا مخرج ایک ہی معنی ہوتا ہے جسے جملہ جملہ القول میں ظاہر کیا گیا ہے، لہذا عاقل اور فہیم وہ ہے جو اسے اچھی طرح سمجھ لے اور خیال رکھے۔ لیکن محض رائے سے خود ساختہ تفسیر کرنا حرام ہے، چنانچہ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے وہ اپنے لئے جہنم میں ٹھکانا بنائے۔ اور اسی لئے سلف کی ایک جماعت ایسی تفسیر سے قطعاً گریز کرتی ہے جس کا انہیں علم نہیں ہوتا تھا۔

لیکن جس شخص کو لغت اور شرح کا اچھی طرح علم ہو، اور وہ تفسیر کے باب میں گفتگو کرتا ہے، تو ایسے شخص کے لئے کوئی مضائقہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ سلف کی اسی مذکورہ جماعت سے تفسیری اقوال بھی روایت کئے گئے ہیں اور دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لئے کہ وہ انہی ائمہ میں بولتے تھے، جنہیں وہ جانتے تھے، اور جس کا انہیں علم نہیں ہوتا تھا اس کی بابت سکوت اختیار کرتے اور ایسا ہی طرز عمل ہر شخص پر واجب ہے۔



تفسیر بالروایات میں محدثین کا تساہل

تفسیر میں جو روایتیں ہیں ان کے متعلق ائمہ حدیث کی شہادت ہے کہ وہ بالعموم ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہے جاتے ہیں، ان کا قول ہے کہ: —

”تین کتابیں ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں — ملاسم، مغازی اور تفسیر۔ (القان)

عام خیال یہ ہے کہ ”صحاح ستہ“ میں جو روایات ابواب التفسیر میں آئی ہیں وہ صحیح ہیں مگر ان پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بھی امام موصوف کے اس قول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ چنانچہ صحاح ستہ سے تفسیر بالروایات کی چند مثالیں نکال کر پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں سے کچھ تو خود قرآن کے مخالف ہیں، کچھ دوسری حدیثوں سے متعارض اور بعض علم و عقل کے خلاف، جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تفسیریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز نہیں ہو سکتیں —

(۱) **وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ** | اور جب کہا ابراہیمؑ نے اے میرے رب! مجھے دکھلا دے کہ **قَالَ أَوْ لَوْ تُؤْمِنُ۔ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لَّيَسْخَبَنَّ لَكَ يَأَيُّ ذُو الْعَرْشِ** | تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تو ایمان نہیں لایا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ بیشک (میں ایمان لایا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے —

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے صحیح بخاری میں یہ روایت درج کی گئی ہے کہ: —
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم ابراہیمؑ سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جبکہ انہوں نے کہا کہ اے رب مجھے دکھلا دے تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے —“

یہ روایت قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی، کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کی تصریح کر دی اور وہ بھی بلی کے لفظ کے ساتھ، یعنی بے شک میں مومن ہوں اور ایمان نام ہے علم یقین کا جس میں کوئی شائبہ شک کا نہ ہو —

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ | مومن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے **شُكْرًا يَوْمَئِذٍ** — (۲۹)

چہ جائے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے اولوالعزم رسول کا ایمان اللہ کے مردوں کے زندہ کرنے پر جو بادشاہ سے اسی مسئلہ پر بحث کر چکے تھے جس کا ذکر اس سے پیشتر کی آیات میں ہے، ان کو اس کے اوپر علم یقین اور ایمان کامل حاصل تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر فطن اطمینان اور عین یقین، نہ کہ کمی شک کا ازالہ، مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو شک تھا —

(۲) **وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ سِنَةَ آيَاتِنَا** | اور ہم نے موسیٰؑ کو لوٹ کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

اس کی تفسیر روایت کے ساتھ اس طرح کی گئی ہے: —

”ایک دفعہ حضرت تشریف فرما تھے، سامنے سے دو یہودی گزرے، ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے

نہیں بن سکتے۔ اب دیکھئے بنی اسرائیل کی حکومت و بقا خود یہود کا کارنامہ ہے۔ یا ساحرانِ فرنگ کی ادنیٰ ساعری کا نتیجہ ہے۔ اگر آیاتِ قرآنہ کے مطلب بیان کرنے میں اصولِ شریعت اور قواعدِ زبانِ عرب کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ ناجائز ہے اور اسی کو تفسیرِ بارائے کہتے ہیں۔
ترمذی شریف میں ہے جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے تفسیر کرے تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں مقرر کر لے۔
یہاں علم سے مراد قواعدِ ہیئت اور اصولِ شریعت کا علم ہے۔ بے شبہ جو شخص ان دونوں علوم سے ناواقف ہے۔ اس کو قرآنِ پاک کی تفسیر کرنا حرام ہے۔ علامہ شاطبی موافقات میں فرماتے ہیں۔

”تفسیر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ تفسیر جو کتاب و سنت کے مطابق اور قواعدِ زبانِ عرب کے موافق ہو۔ اس تفسیر سے اغراض و غنطت ممکن نہیں۔ دوسری تفسیر وہ جو نہ دلائلِ شرعیہ کے موافق ہو اور نہ زبانِ عرب کے قواعد کے مطابق۔ تو بے شک یہ تفسیر قابلِ مذمت ہے۔ ایک حدیث میں ہے:- من قال فی القرآن برایہ فاصاب فقد اخطا۔

جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کوئی بات کہے اگر وہ صحیح بھی ہو پھر بھی اس نے خطا کی۔ (احکام القرآن)
یہ اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن کی تفسیر میں اصول سے ہٹ کر وہ بات کہے جو اور اگر کوئی شخص آیاتِ قرآنہ کا مطلب بیان کرے اور اس کو ایسے معانی پر محمول کرے جن پر سب کا اتفاق ہے وہ شخص قابلِ تعریف ہے اگر کاستحی ہے۔
قرآن مجید کے طالب علم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ہے اور جن مذاہب سے خطاب فرمایا گیا ہے ان سے اور عہدِ نبوت کی تاریخ سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ یہ مطالعہ جتنا گہرا ہوگا اسی قدر آیاتِ قرآنہ کا صحیح اکتشاف ہوگا۔ صورت یہ ہے قرآن مجید نے اپنے نزول تک گمراہ فرقوں، مشرکین، یہود اور منافقین کو خصوصی طور سے خطاب کیا ہے، ان کے عقائد پر بحث تنقید کی ہے اور ان کے مذموم اعمال کی پردہ دری کی ہے۔ اب جس شخص کو ان فرقوں کے عقائد کی واقفیت نہیں ہے یا جس کی نگاہوں میں ان کی اخلاقی اور سیاسی زندگی نہیں ہے۔ وہ متعلقہ آیات کے اسلوب بیان اور طرزِ خطاب کی اہمیت اور استدلال کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، اس طرح قرآن مجید نے جن مسلمانوں کو خطاب کیا ہے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات میں ان کی رہنمائی کی ہے غزوات اور اس وقت کے اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ اب اگر زمانہ نزولِ قرآن کی تاریخ سے کوئی شخص ناواقف ہے تو وہ ان آیات کو ان کے صحیح محل پر نہیں رکھ سکتا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ کسی اہم موقع پر اہم غلطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے۔

اس لئے امام شاطبی ”موافقات“ میں فرماتے ہیں:-
”جو شخص قرآن مجید کو سمجھنا چاہے اس کے لئے نزولِ قرآن کی معرفت ضروری ہے۔“
اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے امام شاطبی نے بڑی لطیف بات کہی کہ:-

”فن معانی و بیان کی بنیاد اس پر ہے۔ کہ نفس خطاب مخاطب کرنے والے اور جس کو مخاطب کیا گیا ہے اس کے متعلق صحیح معلوما ہوں۔ اس کو مقتضائے حال کہتے ہیں۔ اسبابِ نزول کی واقفیت کا مطلب اسی مقتضائے حال کا جاننا ہے۔“

امام شاطبی فرماتے ہیں کہ بسا اوقات اس مقتضائے حال سے ناواقفیت سخت مشکلات کا باعث بن جاتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں مسلمانوں کے حالات اور قرآن کے مخاطب فرقوں کے عقائد، رسوم اور عادات سے واقفیت بھی از حد ضروری ہے۔ امام شاطبی دوسرے مقام میں فرماتے ہیں:- طالبِ قرآن کو عاداتِ عرب کے ناواقفیت بعض اوقات ایسی مشکلات میں ڈال دیتی ہے اس سے نجات کی فصل اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ اس ناواقفیت کو ابھی طرح دور کیا جائے۔ (موافقات)
(قرآن کا مطالعہ کیسے کرنا)

کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو، سن لے گا تو اس کی ہمارا نکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا، اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کون سی دی گئی تھیں؟ آپ نے فرمایا وہ یہ ہیں کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، زمانہ نہ کرو، کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو پھرتی نہ کرو، جاؤ نہ کرو، کسی حاکم کے پاس بے جرم کی بغلی نہ کھاؤ۔ سوڈن نہ کھاؤ، کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ اور میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نوبی حکم میں راوی کو شک ہے) اور خاص تمہارے لئے اے یہود! دسواں حکم یہ ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو، یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔ (یہ حدیث جامع ترمذی، مسند امام احمد، نسائی ابن ماجہ اور ابن جریر میں ہے) —

حضرت موسیٰ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام تسعہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو امام ترمذی نے ”حسن صحیح“ کہا ہے نہ صرف یہ کہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کی رد سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نو نشانیاں حضرت موسیٰ کو کائنات بلی تھیں جب مدین سے بصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت تک نہ تورات نازل ہوئی تھی اور نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔ ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورہ نمل میں ہے: —

فِي تِسْعِ آيَاتٍ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهِ (۱۲) — نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف — پھر سورہ اعراف میں حضرت موسیٰ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کر کے ان نشانیوں کو گنا دیا ہے، یعنی عصا، ید بیضا، قوط ناقص، طوفان، ٹنڈی، بجوں، مینڈک اور خنوز۔

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تورات عطا کرتا ہے —

يٰۤمُوسٰى اِنِّىٓ اصْطَفٰىكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلَتِيْ وَبِكَلَامِىْ فَاْخُذْ مَا اَتٰىكَ وَكُنْ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ وَكَتَبْنَا لَهُ فِى الْاُكُوْحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّا وَعَدْتَدُ وَتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (۱۲۴، ۱۲۵)

اے موسیٰ! میں نے تجھ کو اپنے پیغامات اور ہکلامی کیلئے لوگوں پر چن لیا، سو جو کچھ میں تجھ کو دیتا ہوں لے اور شکر کر اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی تفصیل لکھ دی —

علاوہ بریں اس روایت میں سوڈن نہ کھاؤ، جاؤ نہ کرو، میدان جہاد سے نہ بھاگو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے احکام عشرہ میں سے گنائے گئے ہیں، حالانکہ ان تینوں میں سے ایک بھی ان میں سے نہیں ہے، احکام عشرہ یہ ہیں: — میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہو، تو خداوند اپنے خدا کا نام بے سبب نہ لے (جھوٹی قسم نہ کھا) سبت کے دن کو یاد رکھ، اپنے باپ اور ماں کو عزت دے، خون نہ کر، زمانہ نہ کر، پھرتی نہ کر، اپنے ہمسایہ کی جود کو مرت چاہ، اپنے ہمت پر جھوٹی گواہی نہ دے، اپنے ہمسایہ کے کسی مال کا لالچ نہ کر — (توراست سفر استنا ۵-۶)

۴ — بدقسمتی سے مسلمانوں میں عہد صحابہؓ ہی میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جھگڑے پیدا ہو گئے جس کی وجہ سے انخاص کے مناقب قرآنی آیات سے بھی لٹکنے کی کوشش ہونے لگی تھی، چنانچہ بہت سی آیتوں کی تفسیر ایسی روایتوں کے ذریعہ کی گئی ہیں جن سے معتقد علیہ شخصیتوں کے فضائل ثابت ہوں۔ سورہ حج میں ہے: —

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَهٗ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الْاَرْضِ لَا يَسْتَوِيْ سَوَآءٌ لِّهٖ الشَّيْءُ كَوْبَةٌ

فِي الْأَمْرِ وَالْقَمَرِ وَالْجُودِ وَالْجَبَالِ
وَالشَّجَرِ وَالْدَّوَابِّ وَكَثِيرٍ مِنَ النَّاسِ فَكَثِيرٌ
حَقٌّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يَهِنِ اللَّهُ فَسَالَهُ
مِنْ مَكْرِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ
هَذَا مِنْ خُصْمٍ اخْتَصَمُوا فِي مَا بَيْنَهُمْ (۱۸)

کرتے ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور درخت
اور جاندار اور بہت سے آدمی اور بہتوں پر عذاب کا فیصلہ
ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے
والا نہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ دونوں فریق جنہوں نے

آیت میں "هَذَا" کا مشار الیہ موجود ہے کہ نبی نوح انسان بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کو سمجھ کرتے ہیں۔ اور بہت سے
نہیں کرتے۔ یہ دونوں ہیں کہ ان میں باہمی نزاع رب کے بارے میں ہے مگر روایت یہ کہتی ہے کہ : —

"یہ آیت جنگ بدر میں حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ اور عبیدہؓ کے متعلق نازل ہوئی جو شیبہ اور عتبہ اور ولید کے مقابلے کیلئے گئے تھے
منشکل یہ ہے کہ سورج کی ہے اور جنگ بدر مدینہ میں ہوئی۔ اس لئے یہ شان نزول کیسے ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ یہ روایت بخاری
میں ہے اس وجہ سے علامہ جلال الدین سیوطیؒ کو "هَذَا" سے تین اور جامع البیان کو چھ آیتوں کو مدنی قرار دینا پڑا متاخرین نے تو
پوری سورہ کو مدنی کہہ دیا، چنانچہ مصاحف میں مدنی ہی لکھا جاتا ہے —

اذن قتال سے جو اس سورہ میں مسلمانوں کو دیا گیا ہے یہ خیال ہو سکتا تھا کہ یہ مدنی ہے۔ کیونکہ یہ اجازت مدینہ ہی میں مل سکتی
تھی، مگر جامع ترمذی میں روایت ہے کہ یہ اجازت مکہ سے نکلتے وقت ملی۔ اس لئے اس بنیاد پر بھی اس سورہ کو مدنی کہنا صحیح نہ ہوگا
بالفرض اگر یہ آیات مدنی بھی ہوں تو قرآن سے عدول کوناس میں "هَذَا" کا مشار الیہ مذکور ہے کس طرح جائز ہو سکتا ہے
۶۔ قَالُوا أَنْتَ فَعَلْتَ هَذَا بِإِلْهَاتِنَا يَا بَرِّهِمْ
قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ هَذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِنَّ
كَانُوا يَنْصِلُونَ (۶۲-۶۳)

بُت پرستوں نے پوچھا کہ اے ابراہیمؑ! کیا تو نے ہمارے
بتوں کے ساتھ یہ کیا ہے؟ (ابراہیمؑ نے) کہا بلکہ اس بڑے
... نے کیا ہے۔ ان (بڑے ہوئے بتوں) سے پوچھو

اگر بول سکتے ہوں —

اس کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہؓ سے

روایت کی ہے کہ :

ابراہیمؑ نے ننھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین بار، انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں حالانکہ بیمار نہ تھے اور (اپنی بیوی) سارہؓ کو
بہن بتایا، پھر بتوں کو خود توڑا اور جب بُت پرستوں نے پوچھا تو کہا کہ اس بڑے بُت نے توڑا ہے۔
یہ روایت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے کیونکہ اس میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے —

إِنَّكَ كَانَتْ صِدْقًا نَبِيًّا۔ (۱۹) — حقیقت یہ ہے کہ وہ نہایت سچے نبی تھے۔

اللہ جس کو تحقیق کے ساتھ سچا قرار دے یہ کیسے ممکن ہے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جو اسی کی اولاد اور اسی کی بِلّت کے پیرو تھے
اس کو کاذب کہیں؟ یہ تین کذب حضرت ابراہیمؑ کے جو بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے حضرت سارہ کو بہن بنانے کا واقعہ قرآن میں نہیں ہے
اور جس طرح بریرہ قصہ بیان کیا جاتا ہے اس سے صاف طور پر اس کا مجھول ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ دوسرا جھوٹ کہ انہوں نے کہا کہ میں بیمار ہوں
تو کیا بیماری کوئی ایسی چیز ہے جو انسان میں نادر و نایاب ہے؟ ہزار ہا قسم کی چھوٹی بڑی بیماریاں ہیں جن سے کمتر کوئی انسان خالی ہوتا ہے
اگر اس وقت جبکہ مشرک ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، انہوں نے اپنی بیماری کا غذر کیا تو اس کو کذب قرار دینے کی کیا دلیل ہے۔؟
تیسرا جھوٹ کہ انہوں نے بتوں کو خود توڑا اور الزام لگایا بڑے بُت پر۔ تو یہ طریق معروض بحث میں مخالفوں کو ساکت کرنے کے لئے اختیار

کیا تھا جس سے بہتر احتیاق حق کی اور کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ اس کو مشروط کر کے اس طرح فرمایا کہ یہ بڑے بُت کا فعل ہے۔ اگر یہ بت بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ دیجھو جس کو سُن کر مشرکوں نے کچھ دل میں سمجھا اور سر جھکا لیا اور کہا کہ تمہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں! اس قول کو دنیا میں کوئی صاحب عقل جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ امام رازیؒ نے اس کو اپنی تفسیر میں اصول مناظرہ کے لحاظ سے معارضہ قرار دیا، اور پانچ وجوہ سے ثابت کیا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ بجائے ایک صدیق نبی کے اس روایت کے راویوں کو جھوٹا کہنا زیادہ آسان ہے۔

(۴) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَأَ اللَّهُ مِنْهُمَا فَاذْكُرُوا (۲۳۹) اے مومنو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو اذیت دی، سو اللہ نے اس کو ان کی تہمت سے بری کر دیا۔

اس کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ: —
 ”حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے حیا دار تھے، اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ کوئی حصہ اس کا دکھائی نہیں دیتا تھا، بنی اسرائیل کے لوگوں نے ان کو ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر اپنے بدن کو چھپائے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ ہے کہ ان کو برص یا اور اس قسم کی کوئی بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے، سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو ایک پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور کپڑے لینے کو اس کی طرف بڑھے تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھے لے کر اس کے پیچھے دوڑے یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے، یہاں تک کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں پہنچ گئے، انہوں نے ان کو برہندہ دیکھ لیا اور ان پر ظاہر ہو گیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے، اس طرح اللہ نے ان کا لازم سے موسیٰؑ کو بری کر دیا۔ اس جگہ پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لے کر پہنے۔ پھر پتھر کو لٹھے سے مارنے لگے، اللہ کی قسم! اس میں ان کی لالچی کے نشانات ہیں۔ تین، چار یا پانچ۔“

اس روایت میں غور کرنے کے قابل یہ امر ہے کہ راوی قسم کھا کر بیان کرتا ہے کہ پتھر میں ان کی ضرب کے نشانات ہیں! کب عزم و یقین کے ساتھ کہہ گیا اس نے خود مارتے دیکھا ہے۔ اور یہ اس کے سچے ہونے کی نثانی نہیں ہے۔ علاوہ بریں۔ پتھر بے جان، بے ارادہ شے ہے اس کا کپڑوں کو لے کر بھاگنا ایک معجزہ، نہ امر ہوگا، جو منجانب اللہ ہی ہو سکتا ہے اور یہ چیز حضرت موسیٰؑ جیسے اولوالعزم رسول پر غفی نہیں رہ سکتی تھی، پھر اس کو لٹھے مارنے کے کیا معنی؟ غرض امارات کذب اس روایت میں واضح ہیں۔

”وَإِخْرَاجُ بَنِي إِسْرَءِیْلَ لِمَا يَلْحَقُوا بِهِمْ“ کی تفسیر میں جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ کسی سوال کیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا ہے، پھر ایسا ہاتھ سلمان (فارسی) کے اوپر رکھا اور فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر ایمان ثریا بھی معلق ہو تو اس کی قوم میں ایسے لوگ ہوں گے جو لوگ پائیں گے۔ — پھر اسے ذیل کی تفسیر میں ہے: —

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۲۴۸) اور اگر تم پیٹھ موڑو گے تو تمہارے سوا کسی اور قوم کو اللہ تمہارے عوض میں بدلے گا۔

یعنی اے اہل عرب! اگر تم اللہ کے اُن فرائض کی تبلیغ وغیرہ میں جو اُس نے تمہارے ذمہ عائد کئے ہیں اور جن کی ادائیگی کی وجہ سے تم کو ”خیر امت“ کا لقب دیا ہے، کوتاہی کرو گے تو وہ تم کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کو امام الاقوم بنادے گا جو ان فرائض کو جتنی طرح ادا کرے گی۔

امام ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت لکھتے ہیں کہ: —
 ”لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا؟ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا —
 ”اس کی قوم کو، اس کی قوم کو۔“

ان روایات سے اہل فارس کے ایمان کی بختگی، ان کی دماغی برتری اور ذہنی فوقیت کی سند رسول اللہؐ کی زبان سے مہیا کرنا مقصود ہے۔ کیونکہ وہی خلافت عباسیہ میں مجملہ مناصب حکومت پر قابض تھے اور رواۃ حدیث بھی زیادہ تر عجم ہی سے تھے۔
 (۹) جب یہ آیت نازل ہوئی **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا عَلَيْهٖ وَسَلِّطُوا السِّلَيمَ** (۱۱۳) اے مومنو! نبی پر درود بھیجو اور سلام، تو حضرت بشیر بن سعدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہم کس طرح آپؐ کے اوپر درود بھیجا کریں؟ آپؐ نے دیر تک سکوت کیا، پھر فرمایا کہ **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدًا وَعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ** (۱۱۴) یعنی درود شریف ہے جس کو مسلمان نمازوں میں پڑھا کرتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ روایت صحیح بخاری اور جامع ترمذی دونوں میں ہے لیکن اس درود کے یہ الفاظ اس آیت کی تفسیر نہیں ہو سکتے کیونکہ **صَلُّوا عَلَیْهِ** صرف رسول کا ذکر ہے، اس کے ساتھ آل کا ذکر نہیں ہے اس آیت کے مطابق درود کے الفاظ اس طرح پڑھے جائیں گے، **اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدًا وَآلِ مُحَمَّدٍ**۔ لفظ باریک تسلیم میں شامل ہے۔ یہ درود جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ صرف حدیث سے ثابت ہیں۔ اس درود کو اس آیت کی تفسیر نہیں کہہ سکتے۔

(۱۰) **قُلْ لَا اَسْأَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمُوَدَّةَ** | کہہ دے کہ اس (تبلیغ) پر میں کوئی اجر تم سے نہیں مانگتا، بجز **فِي الْقُرْبٰی** — (۱۱۳) رشتہ سلوک کے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر کی ہے کہ —
 اس شخص پر صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت حملہ بطون قریش میں تھی۔ اللہ نے آپؐ کی زبان سے اعلان کر دیا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغ قرآن اور تعلیم دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذی نے اس کو درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے کہ: —
 ”قریبی کے معنی اس آیت میں ”اِلٰی مُحَمَّدًا“ کے ہیں، یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں ہوائے اس کے کہ میری اولاد کے ساتھ محبت رکھو۔“

یہ بھی دراصل وہی پردہ پگنڈا ہے اور قرآن کی سراسر تحریف۔ کیونکہ قرآن میں **اِلَّا الْمُوَدَّةَ** **فِي الْقُرْبٰی** نہیں ہے بلکہ **اِلَّا الْمُوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰی** ہے اور قرنی کے معنی رشتہ کے ہیں، رشتہ داروں کے نہیں۔ عترت کی محبت لازمی مگر دانسنے سے ان کو خلافت دینا بھی اُمت کا فریضہ ہو جاتا ہے اور یہی ان کا مقصود تھا۔

جامع البیان میں اس آیت کی تفسیر میں ہے کہ: —
 اس شخص پر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ تم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کسی شخص کے دل میں ایمان اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم (یعنی عباسؓ اور ان کی اولاد) کو اللہ و رسول کے لئے محبوب نہ رکھو۔ امام ترمذی نے ابواب التفسیر میں تو نہیں مگر کتاب المناقب میں اس کو درج کیا ہے۔ یہ روایت عباسی خلفاء کی محبت کو لازم گردانتی ہیں جو بغداد میں حکمران تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس ہبیط وحی سے جو تو حید کا منارہ دنیا میں بلند کرنے کیلئے

آیا تھا، ایسا بشر کہ قول ممکن بھی ہے کہ جب کسی کے دل میں اپنے جیسے دوسرے بے بس انسان کی محبت نہ ہو، اس وقت تک ایمان کا داخلہ ہی اس میں نہیں ہو سکتا؛ تعجب ہے کہ اُمتِ اسلامیہ کے بہترین افراد حضرات عشرہ مبشرہ و اصحاب بدر کے دلوں میں کیسے ایمان داخل ہو گیا کیونکہ اُس وقت تک تو حضرت عباسؓ نہجن کی محبت شرط ایمان کہی گئی ہے خود ہی ایمان نہیں لائے تھے۔

(۱۱) ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبریلؑ کہتے تھے کہ جب فرعون خرق ہوئے لگا اور ایمان لانا چاہتا تھا، کاش اس وقت اے محمدؐ تم مجھے دیکھتے کہ میں سمندر کی مٹی لئے ہوئے اس کے مُنہ میں مٹھوس رہا تھا اس خوف سے کہ کہیں یہ کلمہ نہ پڑھ دے اور اس پر اللہ کی رحمت نہ اُجھلے۔

یہ روایت قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے اس وجہ سے اس کا صحیح ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ:۔

(۱) جبریلؑ ہر جگہ اللہ کی طرح موجود نہیں رہتے، قرآن میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ فرشتے بلا حکم الہی نہیں اُترتے (وَمَا نَزَّلُ الْبُرُوقَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ) (۲) جبریلؑ روح القدس ہیں جن کا وظیفہ یہ ہے کہ انبیاء کرام کے پاس اللہ کے پیغامات نہ کہ کلمہ حق سے روکنے کے لئے کسی کے مُنہ میں مٹی مٹھولیں (۳) فرشتے اپنے ارادہ یا مذہب سے کوئی کام نہیں کرتے بلکہ یفعلون مایومرون، وہی کرتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

(۱۲) وَإِنَّا لَنَحْنُ فَحْيٌ وَنُصْنِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ
وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْبَلِ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا
الْمُسْتَأْخِرِينَ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ
اور ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں اور ہم اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔ یہ ترازب ہی ہے جو ان کو حشر میں لائے گا۔ (۲۵-۲۶)

اس آیت کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس میں اگلوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو پہلے گزر گئے اور پچھلوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد فرزند ہوئے، یہ سب کے سب اللہ کے علم میں ہیں جو ان کو قیامت کے دن میدان حشر میں جمع کرے گا اسی مفہوم کی دوسری آیت میں ہے:۔

قُلْ إِنَّا لَا قَائِلِينَ وَلَا لِحَاجِرِينَ لَجْمُ مَوْتُونَ إِلَى
مِيقَاتٍ يَوْمَ مَعْلُومٍ (۵۰-۵۱)
کہہ دے کہ اگلے اور پچھلے ضرور متعینہ دن کی ميعاد پر جمع کئے جائیں گے۔

لیکن جامع ترمذی میں روایت ہے حضرت ابن عباسؓ سے کہ:۔

”ایک حسین ترین عورت (مسجد میں) رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھنے آیا کرتی تھی، صحابہؓ میں سے کچھ لوگ تو آگے کی صف میں بڑھ جاتے تھے تاکہ اس کو نہ دیکھیں، مگر کچھ پیچھے کی صف میں شریک ہوتے تھے اور رکوع کی حالت میں بغل کے نیچے سے جھانکتے تھے، اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری کہ ہم تم میں اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں۔“

مقدمین اور متاخرین کی ایسی تشریح اور صحابہؓ کرامؓ پر ایسا الزام نہ صرف قرآن بلکہ عقل کے بھی منافی ہے۔

(۱۳) دو ایک مثالیں تفسیر بالروایات کی ایسی لکھتا ہوں، جن کی خود دوسری حدیث مخالفت کرتی ہے۔ اسماءؓ کی تفسیر

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ:۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب ہم بیت المقدس میں آئے تو جبریلؑ نے اپنی انگلی سے پتھر کی طرف

اشارہ کیا اس میں سوراخ ہو گیا، براق کو اسی میں (غالباً رسی ڈال کر) باندھ دیا۔

اس کے دو ہی صفحہ کے بعد پھر امام ترمذی حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت لکھتے ہیں کہ: —

لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھ دیا تھا کیوں؟ کیا اس لئے کہ بھاگ نہ جائے، حالانکہ اس کو تو اللہ نے ان کے لئے مسخر کر دیا تھا (یعنی نہ وہ بھاگ سکتا تھا نہ اس کو بھلا گئے کی ضرورت تھی)۔

(۱۴) جامع ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے ایک طویل روایت بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمین سے آسمان تک پانچ سو سال کی راہ ہے، پھر آسمان سے دوسرے آسمان تک بھی اسی قدر فاصلہ ہے اور آسمان سات ہیں جن کے اوپر عرش ہے، اس کا فاصلہ بھی ساتویں آسمان سے پانچ سو سال کی راہ ہے۔ اسی طرح اس زمین کے نیچے زمین ہے پانچ سو سال کی راہ کی مسافت پر اور زمینیں بھی سات ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسری کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ قسم ہے اللہ کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ اگر تم میں سے کوئی رسی زمین کے اسفل ترین طبقہ میں لٹکائے تو وہ ٹھیک اللہ کے اوپر جا کر گرے گی، پھر آپ نے پڑھا۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ (الایہ) —

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی یہ تفسیر کہ اللہ اُدھر سب سے اوپر عرش پر ہے اور اُدھر سب سے نیچے تحت الثریٰ میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہو سکتی۔ رواۃ کو تو نہیں لیکن اس حدیث کے شارحین کو یہ احساس ہوا کہ اس سے اللہ کی ذات پر نہیں بلکہ اللہ کے علم پر گئے گی، کیونکہ اللہ کی ذات تو ایک ہی ہے۔

مگر پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا جب وہ رسی لٹکائی جائے گی اور طبقہ در طبقہ زمینوں میں لٹکتی ہوئی گرے گی تو اللہ کا علم اس کو محیط نہ ہوگا؟ پھر تحت الثریٰ میں پہنچ کر علم الہی پر گرنے کے کیا معنی؟ —

اب اس کے برخلاف ایک دوسری حدیث سنئے کہ وہ بھی ترمذی میں ہے۔ حضرت عباسؓ کہتے ہیں کہ: —

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک ۷۱، ۷۲، ۷۳ سال کی راہ ہے اور سات آسمان ہیں جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے۔ ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے اس کے اوپر سات پہاڑی بکھرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک اسی قدر فاصلہ ہے ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔“

غالباً یہ ”كَانَ عَرْشُ اللَّهِ عَلَى السَّمَاءِ“ کی تفسیر ہے اور چونکہ قرآن میں قیامت کے ذکر میں ہے کہ اس دن عالمین عرشِ اسفل پر اس وجہ سے بکھرے بھی رہیں گے۔ یہ بکھرے کس پہاڑ کے ہیں؟ ہم نے شروع حدیث میں اس کا نام بہت ڈھونڈا مگر نہ پایا۔

یہاں افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ یہ رواۃ حدیث بجز روایت کثی کے اور کوئی علم کٹر جانتے تھے۔ امام ترمذیؒ نے ۱۰۷۱ھ میں وفات پائی جس سے تقریباً ایک صدی پہلے سے مسلمانوں میں نبیت اور جغرافیہ کے فن رائج ہو چکے تھے، اگر انہوں نے ان کا مطالعہ کیا ہوتا تو ایسی روایتوں کو صحیح قرار دے کر درج کرنے کی جرات نہ کرتے۔

یہ ہے ”مشتملہ نمونہ از خروارے“ ان روایات کا جو تفسیر قرآن کے متعلق صحاح ستہ میں وارد ہوئی ہیں۔ جن پر اہل سنت اگر ایمان نہیں تو اذعان ضرور رکھتے ہیں۔ اس سے نہ صرف تفسیری بلکہ ان کی دیگر روایات کے پایہ اعتبار کا بھی اہل نظر اندازہ لگا سکتے ہیں۔

(ماخوذ از علمی رسائل دہلی)

ابن عربی کی تفسیر

ابن عربی — جو نظریہ وحدت الوجود کے مخترع اور موجب ہیں۔ انہوں نے ایک تفسیر بھی لکھی ہے عبد العظیم زرقانی نے اپنی تفسیر مناہل العرفان میں کچھ اقتباس نقل کئے ہیں۔ آپ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ یہ لوگ عرفانی انداز میں کیا کچھ کہنا چاہتے ہیں —

— ان الله يا مكرم ان تذبحوا بقرة کی تفسیر میں ابن عربی لکھتے ہیں:۔
 ”بقرة سے مراد نفس حیوانیہ ہے جس کی حیات خواہش ہے لہذا اس کا ذبح کرنا خواہش نفس کو ریاضت کی چھری کے دھار سے ختم کرنا ہے اور ان افعال سے اُسے روکنا ہے جو نفس حیوانیہ سے مختص ہیں۔“
 — اور سورۃ انبیاء کی آیت — ”ولسليمان الريح عاصفة“ سے ”وذكرى للعابدين“ تک کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے کہ، —

”ولسليمان الريح“ — اور ہم نے سلیمان یعنی انسان کے عقل فعلی کے لئے جو سینہ کے عرش نفس پر متمکن ہے، خواہشات نفس کی ہوا کو مسخر کر دیا۔ ”عاصفة“ جو تیز چلا کرتی ہے، ”تجسری بامصر“ جو اب اس کے حکم سے چلتی ہے، یعنی اُن کی مطیع ہو گئی ہے۔ ”الى الارض“ یعنی زمین بدن تک جو طاعت و آداب سے آراستہ ہے۔ ”التي باركنا فيها“ جس میں ہم نے مکارم اخلاق اور اعمال صالحہ سے برکت عطا کی۔ ”وكتنا بكل شئ“ اور ہم ہر چیز کو جو اسباب کمال سے ہے ”عالمین“ اچھی طرح جانتے ہیں۔ ”ومن المشياطين“ یعنی وہم و خیال کے شیطین میں سے ”من يخلصون له“ کچھ ایسے ہیں جو اس کے لئے بدن کے میوے میں معانی جزویہ کے موتی نکالنے کے لئے غوطے لگایا کرتے ہیں۔

۱۵ — سلیمان علیہ السلام سے عقل فعلی مُراد لینا بہت ہی زیادہ بعید ہے وہ تو ایک جلیل القدر پیغمبر تھے یہاں ان کے معجزات کا بیان ہے پھر عقل فعلی کی اصطلاح یونانیوں سے درآمد کی گئی ہے اور اس کا شجرہ نسب یونانیوں کی دیوالا (عقول عشرہ) کے ساتھ جا ملتا ہے متکلمین اس کا ادراک کرتے ہیں۔ اس معنی میں نہیں کہ ادراک کے لئے دماغ میں کوئی قوت ہی نہیں بلکہ اس معنی میں کہ اس کی وہ خصوصیات، لوازم اور مقضیات وہ نہیں ہیں جو یونانی بیان کرتے ہیں اور نیز یہ کہ اس کا نام عقل کیوں رکھا جائے اس قوت کے لئے عقل کا لفظ عنوان ہے اور اس کے ساتھ شُرک وہ پورا عقیدہ تصور میں آجاتا ہے جو اس لفظ کی تفصیلات کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور پھر اگلے حصہ میں تو کھلی یونانیت آگئی ہے کہ اس میں وہم و خیال اور ہیولے کا کھلا کھلا استعمال کیا گیا ہے اس کے بعد بھی اگر کوئی یہ دعویٰ رکھتا ہو کہ ہمارا تصوف یونانیوں کی خرافات سے باطل منزہ اور پاک ہے، تو ہم اس کے ہوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ حضور والا آنکھوں پر پٹی باندھ کر آپ جو چاہیں ارشاد فرمائیں یا کوئی آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اسی طرح آگے ”ایوب“ کی تفسیر میں — (باقی اگلے صفحہ پر)

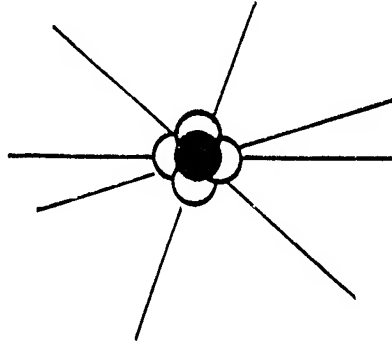
”ويعلمون عملادون ذالك“ اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً صنعت و حرفت اور اکتساب کے دوامی کوبرا نیکی کرنا وغیرہ ”وكنالھو حافضین“ اور ہم ان کی کچی اور غلطی کی گراہیوں اور جھوٹ وغیرہ سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ وایوب“ یعنی اس نفس مطمئنہ نے جس کا کمال تزکیہ تک پہنچانے والی ریاضت اور مجاہدات میں ہر قسم کے ابتلاؤں سے امتحان لیا گیا۔ ”اذنادی ربہ“ جب کہ اس نے اپنے رب کو پکارا سخت ترین مجاہدہ اور انتہائی طاقت صرف کرنے میں شدت کرب کے وقت ”انی مسخی الضی“ کہ مجھ کو ضعف و انکسار اور عجز و لائق ہو گئے ہیں۔ ”وانت ارحم الراحمین“ اور تو وسعت رحمت اور راحت کے ذریعہ تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، ”فاستجبنا لہ“ تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اعمال کی سختی سے احوال کی خوشگواہی دے کر کمال طاعت کے وقت اور سیکھنا نازل کر کے۔ ”وکنفنا ما بھ من ضی“ یعنی ہم نے ریاضت کی سختی کو نور ہدایت سے اور تکلیفات کی ظلمت کو نور قلب کی چمک دے کر دور کر دیا۔ ”وآتینا إھلہ“ یعنی وہ قوائے نفس جس کا ہم نے اسے مالک بنایا ہے اور جسے ہم نے ریاضت کے ذریعہ مار دیا تھا، اس کو حقیقی حیات دے کر زندہ کر دیا۔ ”ومثلھو معھو“ یعنی روحانی قوی اور صفات قلبی کے انوار سے امداد دے کر نیز ہم نے اس کے لئے اخلاقی فضائل کے بہت سے اسباب فراہم کر دیئے۔ اور علوم نافعہ کے احوال سے مالا مال کر دیا، وحمۃ من عندنا و ذکرہی للعاہدین....“

ان اقتباسات کے بعد صاحب ”منابل العرفان“ مخلصانہ نصیحت کے عنوان سے تحریر کرتے ہیں کہ:۔
”یہ تفسیر جس کے کچھ نمونے تم نے دیکھے، کل کی کل اسی قسم کی ہے اور اس میں ان معانی کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے، جن پر صوب قرآنہ دلالت کرتے ہیں۔ یعنی جن کے لئے الفاظ کی وضع ہوتی ہے اور یہ انتہائی خطرناک روش ہے، کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والا یہ سمجھ بیٹھے کہ خالق نے اپنی مخلوق کے لئے اسلامی تعلیمات کے ذریعہ ہدایت دینے اور اپنے پسندیدہ دین کے حقائق کی جانب رہنمائی کرنے میں یہی اشاری معانی مراد لئے ہیں۔ اور شاید تم اس معاملہ میں میری مہنوائی کرو گے کہ کچھ لوگ ان اشارات و کوالف کی شدت کے ساتھ پابندی کرانے کی بنا پر فتنے میں پڑ گئے اور ان کے دل میں یہ بات جم گئی کہ کتاب و سنت بلکہ اسلام کل کا کل بجز ان احوال و واردات کے اور کچھ نہیں ہے جن کا مبنی اس طرح کی تاویلات و توجہات ہے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ امر و حکم بجز تنزیلات کے اور کچھ نہیں، اور یہ کہ لوگوں سے مطالبہ اسی خیالی دنیا میں بھٹکتے رہنا ہے اور جب وہ اس جگہ میں پڑ گئے تو انہوں نے تکالیف شرعیہ کا قلاوڑا تار بھید کا اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی مبلغ ترین نصوص عربیہ کے سمجھنے میں لغت عربیہ کے قوانین کو جو مرتبہ حاصل ہے اسے کوئی وزن نہیں دیا۔“

پھر ستم بالائے ستم یہ کہ وہ خود تو اس زعم فاسد میں مبتلا ہی ہیں، دوسرے بندگان خدا میں بھی یہ خیال پیدا کرتے ہیں کہ وہ وہی اہل حقیقت ہیں جنہوں نے غایت مقصود کا ادراک حاصل کر لیا ہے اور اللہ سے ان کا اس طرح وصل ہو چکا ہے کہ ان سے تکالیف شرعیہ ساقط کر دی گئی ہیں کیونکہ وہ زعم خود ہمیشہ رب الارباب کے ساتھ رہتے ہیں اور یہ — خدا کی قسم بہت بڑا سانحہ ہے جو باطنیہ اور ان جیسے دوسرے دشمنان اسلام کا لایا ہوا ہے، تاکہ شریعت کے سارے اصول کی بیخ کر دیں اور اس کی عمارت کی بنیاد کھود کر پھینک دیں۔ وہ اپنی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ نے بھی

بہ بقیہ حاشیہ گذشتہ، ”نفس مطمئنہ“ کا فقرہ ایسا ہی ہے جیسا کہ چاند اور سورج کو ایک قرار دینا۔ حضرت ایوب بھی ایک جلیل القدر نبی تھے اور یہاں ان کی انابت الی اللہ اور ان کی دعا کے قبول کئے جانے اور ان پر خدا کی رحمت و برکت کا بیان نے (ع۔ غ)

طے کر لیا ہے کہ وہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا۔ اگرچہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے —
 لہذا خیر خواہی اور نصیحت جو واجب ہے اور اس بات کی مقتضی ہے کہ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو اس راہ کی باتوں
 سے خبردار کریں تاکہ وہ اس جال میں نہ پڑیں — اس لئے ہم بائبل اور شوریہ دیتے ہیں کہ ایسی پرتیچ تفاسیر سو فیدہ بیسی تفسیروں
 سے اپنے آپ کو دور رکھیں اور ان جیسی باتوں کے معلوم کرنے کی حرص نہ کریں جو قوم کے کلام میں کتب صوفیا کے ذریعہ پھیلائی
 گئی ہیں، اس لئے کہ وہ سب کی سب ذوق و وجد کی باتیں ہیں جو ضبط و قید کی حدود سے خارج ہیں۔ اور ان میں زیادہ تر
 حقیقت کے ساتھ تخیلات اور حق کے ساتھ باطل کی آمیزش ہے۔ اور اگر تم ان باتوں کو چھانٹ کر الگ کر دو گے تو قائل
 کی مراد بہت کم ظاہر ہوگی اور جو ظاہر بھی ہوگی تو وہ کھلم کھلا کفریات میں سے ہوگی —
 (تاریخ افکار و علوم اسلامی ص ۲۷۸)



۱۷ یعنی شری ذمہ داریوں کی پابندی سے انسان کو برگشتہ کر دینے والی ہیں۔ (مترجم)
 ۱۸ ابن عربی کے تفسیری مسلک کی تشریح اس کی دو مشہور کتابوں، فتوحات مکیہ، اور فصوص الحکم
 میں کی گئی ہے۔ ہم اس بحث کو ایک دوسری کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔
 (استدی غفرلہ)

کشفِ ساق اور شران میں مجاز کا بیان —

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :-

قرآن میں کشفِ ساق (پنڈلی کھولنے) کی تشریحی کیفیت کیا ہے ؟ —
احادیث کی مختلف روایتوں میں اس کی اس طرح تشریح کی گئی ہے —

۱ — قیامت کے دن مخلوقات کے رب و خدا مثل ہوگا، مسلمان سامنے سے گذریں گے۔ سوال ہوگا، تم کس کی عبادت کرتے ہو؟ کہیں گے خدا کی! خطاب ہوگا، تم خدا کو پہچانتے ہو؟ کہیں گے پہچنائے گا تو کیوں نہ پہچانیں گے۔ یہ سن کر خدا اپنی ساق کھول دے گا، جننے مسلمان ہوں گے دیکھتے ہی سجدہ میں سر جھکا دیں گے، منافقین کا گردہ سر جھکا ناچاہے گا تو پیٹھ سخت ہو جائے گی یہ فرق امتیازی مسلمانوں کو منافقوں سے ممتاز کرنے کا —

۲ — قیامت کے دن کفار و مشرکین کے رب و ان کے بت لائے جائیں گے کہ دیکھو تم انہیں کو پوجتے تھے اب انہی کے ساتھ جاؤ، روزخ میں ملو، پھر مسلمانوں کی نوبت آئے گی، خدا ان کے لئے اپنی ساق کھول دے گا سب سر جھک جائیں گے۔ منافقین سجدہ نہ کر سکیں گے، اس لئے جہنم میں گھر بسائیں گے —

اسلام کے علمی زمانے میں ان خام روایتوں کے اخذ و رد میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ لیکن جب روایتیں ہی سرے سے مقطوع الایند ہوں تو ان کو استدلال کرنا ہی غلط ہے — کشفِ ساق کے الفاظ ادبیات عرب میں کس معنی میں استعمال ہوتے ہیں اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک خاص مقدمے کو ذہن نشین کر لینا چاہئے —

(۱) ہر زمانے، ہر نسل، ہر قوم اور ہر زبان کے خاص محاورے ہوتے ہیں۔ ردو حانیت کے ساتھ کمال اتصال کو تورات کے محاورے میں خدا سے لڑنے اور کشتی کرنے سے متعبر کہتے ہیں۔ قرآن ترجمہ و اشفاق کو "آسمان کا رونا" کہتا ہے۔ اردو میں انکار کے لئے "کانوں پر ہاتھ رکھنا" مستعمل ہے۔ عربیوں کو پامال کرنے کے لئے ایران کے قدیم محاورے "دشمن گزائی" کا استعمال تھا۔ اعتلا اقدام کیلئے "بازو برافروختن" کہتے تھے۔ ان سب میں محاورے کے اطلاق کو دیکھتے تھے۔ الفاظ کے اصل معنی سے بحث نہ تھی —

(۲) اسلوبِ تعبیر کی دو حیثیتیں ہیں (الف) حقیقت (ب) مجاز۔ محل حقیقت و مجاز میں مختلف مناسبتیں ہوا کرتی ہیں۔ جن سے ایک ہی لفظ جو پہلے کسی اور معنی کے لئے مستعمل تھا۔ اب ایک جدا گانہ معنی میں استعمال ہو سکتا ہے —

قرآن کریم ایک خاص مقام پر کہہ رہا ہے :-

ما یكون من بخى ثلاثة اِلا هُو راجعهم
ولا خمسة اِلا هُو سادسهم ولا اَدنى
من ذالک ولا اکثر اِلا هُو معهم —

جہاں کہیں تین شخص سرگرم باز و نیاز ہوں وہاں ان کا جو تھا
خدا ہے، پانچ ہوں تو چھٹا خدا ہے۔ اس سے کم یا
زیادہ جس تعداد میں بھی ہوں۔ خدا ان کے ساتھ ہے —

قرآن میں فکر و تدبیر کے تین اصول

مولانا حنیف ندوی لکھتے ہیں: —

ہمارے نزدیک فکر و تدبیر کے یہ تین پیمانے ہیں جو قرآن فہمی کے لئے از حد ضروری ہیں۔ —

۱۔ عصر نبوت کا استحضر — ۲۔ عربی زبان پر کامل عبور — ۳۔ قرآن حکیم سے محبت اور شغف —

(۱) استحضر عصر نبوت کے معنی یہ ہیں کہ پہلے ہم تاریخی طور سے یہ معلوم کریں کہ اُس دور کے مسائل کیا تھے؟ اور وہ کون سے تہذیبی اور عقائد کے اشکالات تھے جن کو حل کرنے کی غرض سے قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس معاشرے اور ماحول میں مصروف اور روزمرہ کی زندگی میں روال دواں دیکھیں کہ اس دور کی قیادت اور اصلاح میں آپ کا کردار کیا رہا اور آپ نے کس کس ڈھب اور انداز سے ایک بگڑی ہوئی اور اخلاق بافستہ قوم کو باہم عروج تک پہنچا دیا۔ عصر نبوت اور قرآن میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس کو سمجھے اور جانے بغیر قرآن فہمی کا دعویٰ یا توانہا درجے کی سادگی پر مبنی ہے اور پھر اس میں فسادِ نیت کا پہلو مضمر ہے کہ قرآن کو ایک مرتبہ اس کے تہذیبی و ثقافتی ماحول سے الگ کر دو پھر جو معنی بھی اس میں سے لکانا جاو گے اُسانی سے نکال لو گے۔ قرآن مجید کے فہم و ادراک کے لئے استحضر عصر نبوت کا نظریہ کچھ قرآن ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ دنیا کی ہر کتاب شخصیت یا فکر کو ذہن کی گرفت میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس ماحول اور کوائف کو چشم تصور میں لایا جائے کہ جن میں یہ کتاب نازل ہوئی یا شخصیت اُبھری یا فکر پر دواں چر لھا پھر اس کے بعد اس کو پہچاننے کی کوشش کی جائے۔ —

(۲) عربی زبان پر عبور کے معنی یہ ہیں کہ اہل علم یہ جان لیں کہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کا مزاج کیسا ہے۔ اس کا زبان کا انداز اسلوب کیسا ہے اور احکام عقائد اور مسائل کو کس بیج سے پیش کرتا ہے۔ اس میں تشبیہ استعارہ اور کنایہ کا کہاں کہاں استعمال ہوا ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب تک ہم زبان دانی کی اس سطح سے آشنائی پیدا نہیں کرتے جس پر قرآن کریم اپنے مخصوص اسلوب اور پیرایہ بیان کے لحاظ سے فائز ہے۔ قرآن حکیم کے مطالب و دقائق تک ہماری رسائی ممکن نہیں۔ —

قرآن حکیم قریش کی صاف تھری زبان میں اُترا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ اپنے عقائد و مسائل کے اعتبار سے بہت سہل ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی عقلی و فکری پیچیدگی نہیں پائی جاتی تاہم جو تکمیل یہ کتاب وحی و تنزیل کا افشردہ عطر ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے فہم و ادراک کے لیے ارباب علم اس زبان کو ابھی طرح جانیں جس میں یہ نازل ہوئی ہے۔ اور اپنے غیر مانوس مطالب و معانی اس کی جانب منسوب نہ کریں جن کی تائید اس کے لسانی تقاضوں سے نہیں ہو پاتی۔ —

(۳) قرآن سے محبت اور شغف کے معنی یہ ہیں، کہ ہم نے عقائد و افکار اور تعبیر و تفسیر کے جن غیر قرآنی صنم خانوں کو اپنے قلب و ذہن میں پہلے سے تعمیر کر رکھا ہے۔ ان سب کو "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ" کی تیغ سے یکسر مٹا دیں تمام تعصبات سے خالی الذہن ہو کر اس کا مطالعہ

یہ حقیقت اس مجاز سے وابستہ تھی کہ تین ہم صحبتوں کا چوتھا شریک اور پانچ شرکا مجلس کا چھٹا جلسہ ان کے مکالمہ سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کی رازداریاں اس پر منکشف ہو سکتی ہیں اور ان کے مخفی امور کو سن اور سمجھ سکتا ہے۔ آیت کا بھی یہی مدعا تھا۔ اور اس کے لئے اس سے بہتر اسلوب ممکن نہ تھا۔ ایک دوسری آیت میں ہے:۔

و اعلموا ان اللہ یحول
بین السمر و قلبہ

خوب جان رکھو کہ انسان اور اس کے دل کے مابین خدا عامل ہو جایا کرتا ہے۔
دل اور جسم کے مابین حائل ہونے والے سے بڑھ کر اور کون ہے جسے مخفی باتوں کا حال معلوم نہ ہو سکے۔ یہاں بھی جناب الہی کو یہی غرض تھی۔ لہذا حقیقت اس مجاز کے لباس میں نمودار ہوئی۔ ایک مشہور آیت ہے:۔
الْوَحْنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ ۚ خُذِ السُّفْتَ بِرُكْحَلَيْهِ ۚ
کھڑے ہونے (استواء) کی حقیقت میں استیلا کا مجاز مضمر تھا۔ اب بھی محاورے میں کہتے ہیں۔ بلغار کا سخت متزلزل ہو گیا۔ یعنی اس کے استیلا میں ضعف آگیا۔ پہلی صدی کا ایک عرب شاعر کہتا ہے:۔

قد استوى بطن على العرات ۚ من غير سيف و دم مہرات

عہد اموی کا ڈکن (امیر لشیر عراق) کے سخت پر کھڑا ہو گیا۔ بغیر اس کے کہ تلوار چلائے یا خون بہائے۔ (یعنی اس نے اقتدار پر قبضہ کر لیا)
قرآن کو بھی یہ حقیقت اس مجاز کے اسلوب میں نمایاں کرتی ہے۔ سورۃ رحمن کی ہیبت ناک وعید:۔
سَنَفْرُغُ لَكَ أَيْتَهُ الثَّقَلَانِ
اے جن دانس کی جماعت! ہم عنقریب تمہارے لئے خالی ہو کر فارغ ہونا چاہتے ہیں:۔

فارغ ہونے اور خالی بیٹھنے کی حقیقت اس مجاز نے منع کردی کہ جن لوگوں کے مشاغل کثیر ہوتے ہیں وہ کوئی ہتم ہاشان کام کرنا چاہیں تو اس مشغولیت کے عالم میں خاطر خواہ نہ کر سکیں گے۔ اس لئے انہیں ایک مخصوص وقت نکالنا ہوگا، مفہوم کو دل نشین بنانے کے لئے قرآن کریم نے بھی اس تجوز کو لے لیا کہ لوگو! خبردار رہو، تمہارا حساب کرنے کے لئے ہم عنقریب ایک خالی وقت نکالنے کو ہیں کہ اچھی طرح محاسبہ ہو اور کافی محاسبہ و اعتبار ہو جائے۔ اب آیت کے دیکھیں کشف ساق کا اصل مفہوم کیا ہے۔

علامہ ابن جریر اس کا جواب دیتے ہیں:۔

قال جماعة من الصحابة والتابعين
من اهل التأويل يبدون من امر
شد يد و كان ابن عباس يقول كان
اهل الجاهلية يقولون كشف الحرب
عن ساق

مفسرین صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے کہ
آیت "وہ دن جب ساق کھلے گی" کے معنی یہ ہیں کہ امر
ظاہر ہوگا۔ ابن عباس اس کی مثال میں کہا کرتے تھے۔ جب عینیت
کا محاورہ تھا کہ جنگ نے اپنی ساق سے ازار کو اٹھالیا، یعنی
پوری طرح چھڑ گئی۔

وعن عكرمة في قوله يكشف عن
ساق، قال هو يوم كرب، وذكر عن ابن
عباس انه كان يقتر ذلك يوم فكشف
عن ساق، بمعنى يوم فكشف القيامة

عکرمہ سے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی روایت ہے کہ وہ دن
کرب و سختی کا دن ہوگا۔ ابن عباس اس آیت کو یوں بھی پڑھا
کرتے تھے کہ وہ دن جب ہم ساق کھولیں گے۔ یعنی بڑی سختی
برپا کریں گے جب کوئی بات نہایت سخت ہو جاتی ہے تو

عن شدة والعرب تقول كشف هذا الامر
عن ساق اذا صار الى شدة —
علامہ عزالدین بن عبد السلام لکھتے ہیں :-

هو مجاز عن مبالغة في حساب اعداء
واهانته وخريره وعقوبته وفان
العرب يقولون لكل من جدافي امر و
بالغ فيه كشف عن ساقه واصله، ان من
جدافي عمل الاحمال حزب او غيرها
فاناء يشتر ازارا عن ساقه كيلا يعوقه
عن جداه و سرعة حركته فيما جد فيه۔

آیت کے معنی مجازی ہیں، مراد یہ ہے کہ دشمنان خدا کے مجاہد
وتذلیل ورسوائی و تذلیل میں مبالغہ ہوگا، جب کوئی شخص کسی
کام میں نہایت مبالغے کے ساتھ کوشش کرتا ہے تو اہل عرب
کہتے ہیں "اُس نے اپنی ساق کھول دی" اس کی صلیت
یوں ہے کہ جب کوئی شخص کسی بڑے کام میں سرگرم ہوتا ہے خواہ
جنگ ہو یا کوئی اور کام ہو تو ازار کو اوپر چڑھا لیتا ہے کہ تیزی
و سرگرمی کے ساتھ جو کام کرنا چاہتا ہے اس میں صرح واقع ہو

قرآن میں حجاز کی مثالیں

نرمی نرم دلی (ذلت) کے بھی پُر نہیں ہوتے جسے نیچے لائیں یا اوپر اٹھائیں مگر اس آیت میں ہے :-
(۱) وَإِخْفِضْ لَهُمَ جَنَاحَ الذُّلِّ
مِنَ الرَّحْمَةِ۔
ماں باپ کے لئے مہربانی کے ساتھ نرمی و ملائمت کے
پر نیچے کرو، یعنی بچھا دو۔

(۲) قرآن کے ہاتھ بھی تو نہیں ہیں مگر قرآن خود کہہ رہا ہے :-
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔
یعنی تورات و انجیل جو اس کے رو برو ہے وہ اس کی تصدیق کر رہا ہے۔

(۳) کفر بھی تو ہاتھ نہیں رکھتا مگر اس کے تذکرے میں ہے :-
ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمْتَنِي يَدَاكَ

(۴) عذاب بھی تو کوئی مجسم شکل نہیں ہے کہ اُس کے ہاتھ پاؤں ہوں مگر قرآن کا بیان ہے :-
إِنِّي نَذِيرٌ لِّكُمُ بُيُوتٍ يَدِيكَ
عَذَابٌ شَدِيدٌ۔
یہ کیفیت تیرے دونوں ہاتھوں کی لائی ہوئی ہے۔
سخن عذاب کے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں پڑنے سے
میں تم کو ڈراتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان کے ایک شاعر کے لئے جب یہ ادبی معذرت قابل پذیرائی ہے کہ :-
ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
تو اہل نظر کی اس تحقیق کا کیوں نہ لحاظ کیا جائے کہ :-

(الغرض من هذا انه قد يعبر بالجواح عن
معان لا يصح ان يكون خارجة عن
الغرض من هذا ان لا يعبر بالجواح عن
معان لا يصح ان يكون خارجة عن

غرض یہ ہے کہ تعبیر کلام میں اعضا و جوارح کا تذکرہ کرتے ہیں
اور اس سے وہ معانی مراد لیتے ہیں جن کا اصل مفہوم سے الگ نادرست ہیں۔

قرآن کریم میں لفظ ساق تین مقام پر وارد ہے۔ (الف) سورۃ قیامت میں بحرف ملا حلفہ فرمایا ہے۔

وَجَوْا يَوْمَئِذٍ نَاصِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ
وَوَجَوْا يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ تَطْلُبُ أُنَافِثُ
بِهَا فَاقِرَّةٌ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَافِقَ
وَقِيلَ مِنَ سَاقٍ وَظُنَّ أُنَّهُ
الْفُرَاتُ - وَالتَّفَتُّ السَّاقُ بِالْمَاقِ
إِلَىٰ مَرَاتِلٍ يَوْمَئِذٍ نَاطِرَةٌ

(القرآن)

اس دن بہتوں کے منہ تر تڑپ رہے ہوں گے جو اپنے پروردگار کی رحمت کے منتظر ہوں گے اور بہترے منہ اُس روز بڑے بن رہے ہوں گے اور ان کو گمان ہوگا کہ ایسی سختی اُن کے ساتھ ہونے والی ہے کہ ان کی کمر توڑ ڈالے گی بخوب سمجھ لو کہ جب منہلی ہلک جان آپسچے گی۔ اور وہ لوگ چلنا اٹھیں گے کہ کوئی جھانٹنے والا ہے۔ یہ یقین ہو جائے گا کہ یہ مفارقت کا وقت ہے اُس وقت پنڈلی سے پنڈلی پسٹ جائے گی، تو یاد رکھ تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا۔

اس آیت کبیرہ میں التفات ساق کی کئی تاویلیں کی گئی ہیں۔ مگر ابن جریر کی نقاد نظر میں یہ سب مجروح ہیں وہ لکھتے ہیں:

أَوَّلُ الْأَقْوَالِ فِي ذَلِكَ بِالصَّحَّةِ عِنْدِي
قَوْلُ مَنْ قَالَ: مَعْنَى فَاكُ وَالْتَفَتِ سَاقُ
الدُّنْيَا بِسَاقِ الْآخِرَةِ وَذَلِكَ شِدَّةُ كُوبِ
الْمَوْتِ بِشِدَّةِ هَوْلِ الْمَطْلَعِ - وَالَّذِي يَدُلُّ
عَلَىٰ أَنَّ ذَلِكَ تَأْوِيلُهُ قَوْلُهُ: إِلَىٰ مَرَاتِلٍ
يَوْمَئِذٍ الْمَاقِ - وَالْعَرَبُ تَقُولُ لِكُلِّ امْرِئٍ
اشْتَدَّ - قَدْ شَمِرَ عَنْ سَاقِهِ وَكُشِفَ عَنْ سَاقِهِ، أَعْنَى
لِقَوْلِهِ التَّفَتُّ السَّاقُ بِالْمَاقِ - التَّصَقَّتْ أَحَدَى
الشَّهَدَتَيْنِ بِالْآخَرَىٰ

میرے نزدیک اس باب میں بہتر و صحیح قول ان مفسرین کا ہے جو آیت کے معنی یہ بتلاتے ہیں کہ دنیا کی ساق آخرت کی ساق بل جانے گی، مطلب یہ ہے کہ موت کی شدت و کرب ہول مطلع کی شدت سے دوچار ہوگی۔ اس مفہوم کی دلیل خود اس آیت کا پچھلا جُز ہے۔ اُس دن تجھے اپنے پروردگار کی طرف چلنا ہوگا۔ خطرہ جب بڑھ جاتا ہے اور بات سخت ہو جاتی ہے۔ تو اہل عرب کہتے ہیں فلاں امر کی ساق سے دامن اٹھ گیا یا اس کی ساق کھل گئی۔ آیت میں ایک ساق بل جانے کے معنی یہ آئے کہ ایک سختی دوسری طرح کی شدت سے پیوست ہو گئی۔

سورۃ نمل میں جہاں ملکہ سبا کو خطاب کیا گیا ہے۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصُّرْحَ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ عَنْ سَاقِهَا، قَالَ إِنَّهُ صُورٌ
فَمَرَّتْ مِنْ قَوَارِيرٍ

ملکہ سبا سے کہا گیا کہ محل کے اندر آؤ اُس نے محل کو دیکھا تو پانی سمجھی۔ اس خیال سے اپنی دونوں پنڈلیاں اس نے کھول دیں، سلیمان علیہ السلام نے دیکھ کر کہا کہ یہ تو شیخس محل ہے۔

اس آیت میں کشف ساق کے معنی عام مفسرین نے پنڈلی کھولنے کے کئے ہیں۔ امام رازی نے بتعاد دین باتیں اور بھی بیان کی ہیں۔

نہ مارتے ہیں:

حضرت سلیمان نے شیخس محل اس لئے بنوایا تھا کہ ملکہ سبا کی نظر میں ان کی عظمت بڑھ جائے۔

(۱) لَأَتِمَّاعْلَامُ ذَٰلِكَ لِيَزِيدَهَا اسْتِعْظَامًا
لَا مَرَّةً

تعمیر محل سے مجلس کو خوفناک و باعظمت دکھانا مقصود تھا۔

(۲) كَانَ الْمَقْصُودُ مِنَ الصُّرْحِ تَهْوِيلُ الْمَجْلِسِ وَتَعْظِيمُهُ

ملکہ سبا سمجھی کہ حضرت سلیمان اُس کو پانی میں غرق کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) حَبِثَتْ أَنْ سَلِيمَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِفِرْقَانِ اللَّجْبَةِ

یہ باتیں اگر صحیح ہیں تو ان کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مسیح سببا کو مرعوب کرنے اور اس کے دل پر اپنی میست و عظمت کا سکہ بٹھانے کے لئے شیش محل تعمیر کرایا ہوگا، ملکہ سببا اُسے دیکھ کر پانی کھجی اور یہ خیال کیا کہ حضرت سلیمان نے بدھمدی کی کہ یہاں ہلا کر مجھے غرق کرنا چاہتے ہیں، اس خیال کے آتے ہی ساق کھول دی، یعنی غیلا میں آگئی، گھبرا اٹھی، ناراضگی بڑھ گئی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: یہ پانی کا تھنچ نہیں شیش محل کا مراب ہے۔ بلکہ یہ سن کر کھجھتاں اور اپنی بدگمانی پر کافی پریشان ہوئی اور اس کے بعد عہد کیا:۔

میرے پروردگار میں نے (یہ گمانی کر کے) اپنی جان پر ظلم کیا، اب میں سلیمان کے ساتھ ہو کر رب العالمین کیسے مسلمان ہوتی ہوں۔

مَا تَرَىٰ فِي ظَلْمَتٍ لَّفْظِي وَاسْلَمْتُ مَح
سَلِيمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ
(مورۃ نمل)

اب حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کیوں ایسی ترکیب کی کہ ایک پرائی عورت اپنی پندلیاں کھول دے اور وہ اُسے دیکھیں۔ جب اعتراض ہی رفع ہو گیا تو جواب دینے کے لئے کسی تاویل کی کیا حاجت ہے؟۔ گذشتہ مباحثے معلوم ہوا ہے کہ (الف)۔ قرآن کریم نے پندلی کے معنی میں ساق کا لفظ نہیں بھی استعمال نہیں کیا۔ (ب)۔ قرآن کریم میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے، جس سے اس کا قطعی ثبوت مل سکے۔

بخاری کی مشہور حدیث،

ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا، کہ ہمارا پروردگار قیامت کے روز اپنی ساق کھول دے گا جتنے مسلمان مرد عورتیں ہوں گی سب کے سب سجدے میں گر پڑیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو دنیا میں دکھانے اور سنسانے کیلئے سجدہ کیا کرتے تھے، وہ اس وقت سجدہ کرنے چلیں گے تو ان کی پیٹھ ایک تخت ہو جائے گی۔

سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ، يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقَةِ فَيَسْجُدُ لَهُ كُلُّ مومنٍ وَمومنَةٍ وَيَبْقَىٰ مِنْ كَانَ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رِيَاءً وَسَمْعَةً فَيَذْهَبُ يَسْجُدُ فَيَعُودُ ظَرْبًا وَاحِدًا۔
(بخاری)

تو قطع نظر دیگر مباحث کے جو توجہ یہ تفسیر قرآن کریم کی آیات کی کی جاتی ہے، ضروری ہے کہ اس حدیث پر نظر ثانی کی جائے نظام نیشاپوری کی اس لطیف توجہ کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں،

آیت کے معنی یہ ہیں، کہ اُس دن صورتِ معاملہ نہایت سخت و شدید دشوار ہو جائے گی، ورنہ اصل میں نہ تو وہاں ساق کھلنے کا شائبہ ہے، اور نہ ساق ہی ہے، کہ کھلی یا دھکی رکھی جائے، مثلاً ایک نخل کے ہاتھ کٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ نہ وہاں ہاتھ ہیں اور نہ بندش ہے، بلکہ دراصل میٹل ہے جس سے اظہار و نخل منظور ہوتا ہے۔

معناه يوم يشتد ويتفاخم، ولا يكشف ثمة ولا ساق، كما، نقول للا قطع الشجيرة، يذاه مغلوله ولا يذاه ولا غل، وانما هو مثله في البخله وقال ابو سعيد الضرير ساق الشجر ١٢ صله الذي به قوامه، كساق الشجر ساق الانسان فمعنى الآية

یوم تظہر حقائق الاشیاء و اصولها۔

ابوسعید ضریر کہتے ہیں، سابق و شئے ہے جس سے کسی چیز کا قوام وابستہ ہو۔ جیسے سابق درخت، سابق انسان اس بنا پر آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ اس دن اشیا کی حقیقتیں اور اہمیتیں ظاہر ہوں گی۔

جو کچھ پیش آتا ہے دنیا ہی میں پیش آئے گا۔ قیامت سے ان واقعات کو تعلق نہیں ہے۔ قیامت وہ دن ہے، کہ کسی عبادت کی تکلیف نہ دی جائے گی۔ نہ وہاں رکوع ہے نہ سجود ہے، نہ قعود ہے نہ قیام ہے۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

یوم یکشف عن سابق ویدعون
الہ السجود فلا یتطعیون۔

وہ دن جب خطرہ بڑھ جائے گا۔ لوگ سراٹھانگی کے لیے بلائے جائیں گے، مگر نہ کر سکیں گے۔
پھر چونکہ ممکن ہے کہ قیامت کے دن جو اعتبار کا دن ہے انہیں کسی عبادت کا حکم دیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ، وہ قیامت کی ہیبت سے اتنے پریشان ہوں گے کہ عبادت کے ہر صحیح انداز کو بھی بھول جائیں گے۔ اس سے ان کی ذہنی پریشانی اور تشویش فکری مراد ہے۔

(مقالہ الابرار الکرام از آؤ)

امثال القرآن

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں: —

تمثیل کی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کے لئے کسی ایسی چیز سے تشبیہ و مجازے جو واضح اور محسوس ہو، دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیز عام لگا ہوں سے اوجھل ہوتی ہے تمثیل کے ذریعہ سے تجویز اس کا مشاہدہ کر دیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ طرز بیان بڑی کثرت کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے وہ قریب قریب سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس ہوتے ہیں، لہذا قرآن مجید کی تمثیلات کا مضمون بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں تہہ بر کرنا مطالب قرآن کو سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

(۱) — قرآن منافقین کے بارے میں کہتا ہے: —

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اس کے آس پاس کی چیزیں جھک اٹھیں تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا ان کو کچھ سوچتا ہی نہیں یہ بہرے گونگے اندھے ہیں کہ (راہ راست پر) نہیں سکتے یا مثلاً آسمانی بارش آئی جس میں تاریکیاں، گرج اور بجلی ہے کرکے کا یہ حال ہے کہ وہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں لے لیتے ہیں اور جھک کا یہ زور ہے کہ آنکھیں اندھی ہوئی جاتی ہیں اور کافروں کو چاروں طرف سے اللہ نے گھیر رکھا ہے، جب ان کے آگے بجلی چمکی وہ اس کی روشنی میں کچھ دور چل گئے، اور جب ان پر تاریکی چھا گئی تو کھڑے (کے کھڑے) رہ گئے، اللہ اگر چاہے تو ان کی سنسنے اور دیکھنے کی قوتیں سلب کر لے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمٍ لَا يَبْصُرُونَ هُمْ بَكُوءٌ عُتِيُّوهُمْ لَا يُرْجِعُونَ ۚ اذْكَصَيْبَ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمٌ وَرَعْلٌ وَبُزُقٌ يَجْعَلُونَ اَصَابِعَهُمْ فِي اُذُنِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللَّهُ مُخِيطٌ بِالْكَافِرِينَ هَكَذَا الْبُزُقُ يَخْطُفُ الْبَصَارَهُمْ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشْوَافِيهِمْ اِذَا اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(بقرہ - ۲)

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے منافقین کے حسب حال دو مثالیں بیان کی ہیں۔ ایک نادری دوسری ماتی غور کرو تو معلوم ہوگا کہ اس میں فلسفہ ہدایت کی گہری حکمت پنہاں ہے۔ یہی دونوں چیزیں (آگ اور پانی) روشنی اور زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ آگ روشنی کی اصل ہے اور پانی زندگی کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی وحی کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کے اندر دلوں کے لئے زندگی اور نور ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا ہم اس نے روح اور نور رکھا ہے۔ اور اسے قبول کرنے والوں کو "احیا" (زندہ) کہتا ہے جو روشنی میں ہیں، اور منکرین کو "اموات" (مردہ) بتاتا ہے جو تاریکی کی وادلوں میں بھٹک رہے ہیں۔ یہاں منافقین کی حالت اس مناسبت سے بیان کی ہے کہ انہوں نے وحی الہی کو قبول نہ کیا لیکن اپنی غریب

ہدایتوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے، اسی لئے ان کو اس شخص کے مشابہ قرار دیا ہے جس نے آگ بجلائی روشنی حاصل کرنے اور بہرہ مند ہونے کے لئے، لیکن اس کی یہ کوشش نتیجہ خیز نہ ہوئی، منافقین کی حالت اس سے بالکل ملتی جلتی ہے۔ بایں طور کہ انہوں نے دائرۃ اسلام میں قدم رکھا، اس کی روشنی میں چلنا چاہا، فوائد حاصل کئے، اس کے دامن میں پناہ لی اور مسلمانوں میں بل گئے، لیکن چونکہ اس میل ملاپ کا محرک کوئی ایمانی بندہ نہ تھا جس کا نور ان کے دلوں میں واقعہ موجود ہوتا، اس لئے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھا دی اور ان پر ظلمت و تاریکی کا پردہ ڈال دیا اور قرآن کی اس حکمت پر بھی ایک نظر ڈالو کہ اس نے "ذَہَبَ اللّٰهُ بِنُورِہِمْ" (ان کی روشنی زائل کر دی ہے "بنا دھو" یعنی ان کی آگ بجھا دی، نہیں کہا آگ کی خاموشی روشنی سمجھنا اور جھٹلانا دونوں ہے۔ سو اللہ نے روشنی تو ان سے سلب کر لی اور جھٹلانے کی تاثیر باقی رکھی اور ان کو تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دیا، یہی اس شخص کی صحیح تصویر ہے جس نے بنیائی سے کام لیا، پھر آنکھوں پر خود ہی پٹی باندھ لی، معرفت و ہدایت کی سعادت مائل کی، پھر خود ہی انکار کی لعنت اور ڈھلی۔ حدود اسلام میں داخل ہوا، پھر باطنی لحاظ سے آپ ہی آپ اُلٹے پاؤں پھر گیا اور ادھر کا رخ نہ کیا۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ "اَبْ دُو لُؤْنِے دَالِے نَہِیْنِ"۔ اب ذرا قرآن کی آبی تنییل کے آئینہ میں بھی منافقین کی تصویر دیکھ لو۔ قرآن کہتا ہے کہ منافقین کی مثال ان کو کی سی ہے جو چلتے چلتے زور شور کی بارش میں گھر گئے ہوں۔ بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے۔ مولنا کی بکلیوں کی کرک چمک ہے، شمع قلب اور سر سبکی سے ان کا برا حال ہے۔ تاریکی میں کبھی رو رہ کر بکلی جلتی ہے تو اس کی مدد سے دو قدم چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی کرک جاتی ہے تو گوندتی ہے تو ذرا کے ماسے کانوں میں انگلیاں مٹھوٹس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ کہیں ماعنق آسمانی اُن لے اور تار حیات ٹوٹ نہ جائے۔ بس اسی طرح ان منافقین کے لئے بھی رحمت الہی کی وہ بارش ہو قرآن کی صورت میں ہوئی، ان کی اپنی کبی عقل، ضعف دماغ اور قلب علم و بصیرت کی وجہ سے رحمت بن گئی، قرآن کے احکام امر و نہی، اس کی دعوت، جہاد و قتال اور نفس پرستوں پر اس کی زبردستی ان کے لئے بجلی کی کرک اور چمک بن گئے جن کی تاب لانا ان کے بس میں نہ تھا بلکہ بلی بلی بے ضرر تعلیمات کی روشنی میں تو وہ کچھ چل لیتے ہیں، مگر جہاں آزمائش کے معاملات آجائیں، یا جہاں تاویلات کی گنجائش نہ دے کہ دونوں فیصلہ کر دینے والی آیت آجائے وہاں رحمت کشش اور پرتی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ہمارا یہ روز کا مشاہدہ ہے کہ جب گمراہ اور بدعتی فرقوں کے سامنے قرآن کی کوئی صریح آیت پیش کر دی جاتی ہے تو وہ ایسے سرسٹ پڑتے ہیں کہ گویا بحر یوں کے سامنے کہیں سے اچانک کوئی بھوکا شیر آگیا۔ حالانکہ قرآن کی آیت تو فی نفسہ رحمت ہے، مگر ان کیلئے سخت مصیبت بن جاتی ہے۔ اس کی چکا بچوند میں وہ اُلٹا اور راستہ بھول جاتے ہیں اور اس کی آواز ان کے لئے بجلی کا کرک بن جاتی ہے جس سے جان بچانے کے لئے انہیں کانوں میں انگلیاں مٹھوٹس لینی پڑتی ہیں۔ ان کی یہ حالت کیوں ہوتی ہے؟ صرف اس بنا پر کہ ان کی عقلوں اور دلوں پر حق سے نا مانوسیت کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان کے کمزور دل صفات الہی کے روحانی بار کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے، اس وجہ سے وہ اعراض و نفرت پر ٹل جاتے ہیں۔ انہیں کے مثل ان مشرکوں کا (خواہ ان کے مختلف گروہ اپنے مشرکانہ خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں حال بھی یہی ہیں) کے سامنے خالص مسئلہ توحید مبرہن ہو کر آتا ہے اور قطعی دلائل و نفوس ان کے مشرکانہ ادھام کی دھجیاں بکھر کر رکھ دیتے ہیں تب بھی ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان پر قرآن کی بات اتنی شاق گذرتی ہے اور وہ اس سے اس قدر وحشت کھاتے ہیں اگر ان کا بس چلے تو اپنے کانوں کو بند کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔

(۲) — سورہ رعد میں اسی فلسفہ ہدایت کو دوسرے پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ وہاں مؤمنین کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں بھی یہی دونوں ناری و مانی تنییلیں بیان فرمائی گئی ہیں مگر دیکھو کہ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِیَّتْہُمْ یَقْدَرِہَا | اللہ نے آسمان سے پانی برسا یا، پھر اپنی اپنی (سمائی) کے بقدر

فَاَحْتَمَلَ السَّيْلُ مَرَّ بَدَاً اِثْرًا يَبَاطُ وَهَمَّ اَيُّوْقِدُ ذُنَّ
عَلَيْهِ فِي الثَّارِ ابْتِغَاءً حَلِيَّةٍ اَوْ مَتَاعٍ مَرَّ بَدَاً مِثْلُهُ
كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا
الرَّابِدُ فَيَنْهَضُ جُنَاحًا وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ
النَّاسَ فَيَمْلِكُ فِي الْاَرْضِ كَذَلِكَ
يَضْرِبُ اللَّهُ الْاَمْثَالَ ۝

(رعد - ۲)

اس سے ندی نالے بن گئے اور پھر (پانی کے) ریلے میں جھاگ
بن کر اوپر اٹھ آئے، اسی طرح زیور یا دوسرے سازو سامان
بنانے کے لئے (معدنیات کو) جب لوگ آگ میں تپاتے ہیں
تو ان میں بھی اسی طرح کا جھاگ ہوتا ہے۔ یوں اللہ حق و باطل
کی مثالیں بیان فرماتا ہے۔ سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور
(پانی) جو لوگوں کے کام آتا ہے زمین میں پھیرا رہتا ہے۔ اللہ
اسی طرح مثالیں بیان فرماتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کو جسے وہ قلبِ انسانی کو زندہ کرنے کے لئے اُتار دیا ہے پانی سے تشبیہ دی ہے جو زمین کو زندہ کرنے کیلئے
برسایا جاتا ہے اور دلوں کو ندی نالوں سے تشبیہ دی ہے جس طرح ندی نالے آسمان کی بارش کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق اپنے سینوں
میں بھر لیتے ہیں۔ اسی طرح انسانی قلوب بھی درجائے معرفت سے بقدر ظرف لے لیتے ہیں، جو قلب جتنی زیادہ وسعت رکھتا ہے وہ
اسی قدر علم و بصیرت کا خزانہ وحی الہی کے فیضانِ عام سے حاصل کر لیتا ہے۔ پانی کے ساتھ وحی اور ندی نالوں کے ساتھ قلوب کی
تشبیہ کس قدر بلیغ ہے۔ پھر دیکھو بادلوں سے جب بارش ہوتی ہے اور زمین پر پڑ کر دھارے کی شکل میں بہنے لگتی ہے تو اس وقت زمین
کی تمام غلاتیں اور میل کھیل انھیں دغا شک سب اُبھر کر سطحِ آب پر آ جاتے ہیں مگر چند لمحوں کے بعد کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں رہتا
اور وہی پاک و صاف پانی باقی رہ جاتا ہے جو انسان کے لئے مفید ہے۔ اسی علم و بصیرت اور رشد و ہدایت کا آب رواں بھی جب قلوب
کی داریوں میں اُترتا ہے تو پہلے تمام ذہنی ہوائی کثافتوں کو اُبھار دیتا ہے اور بالآخر نفسانی خواہشوں اور شکوک و ادہام کی گندگیوں کو فنا کر کے
دلوں کو انوارِ الہی کا مہبط بنادیتا ہے۔ اس کی مثال بعینہ دفا کی سی ہے جو جسم کے اندر داخل ہو کر تمام اخلاطِ جسم کو اُبھار دیتی ہے۔ اور مریض
ایک طرح کی ناگواری محسوس کرتا ہے حالانکہ تمام اخلاط کا اُبھار دانا کے فوائد میں سے ہے۔

کیونکہ وہ انہیں اُبھارتی ہی اس لئے ہے کہ فنا کر دے جیسا کہ اس کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھو اور پھر حق و باطل کی باہمی آمیزش
کا تصور کرو، حق نمودار ہوتا ہے تو دلوں میں چھپی ہوئی باطل کی تمام قوتیں سر نکال لیتی ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ حق خود ہی کرید کران قوتوں کو اُبھارتا ہے
تاکہ انہیں باہر نکال پھینکے کچھ مدت تک تو وہ قوتیں ایک بحرانی کیفیت میں اُبھری رہتی ہیں لیکن آخر کار فنا ہو جاتی ہیں اور آئینہ قلب باطل میں
ہو کر چمک اُٹھتا ہے۔ یہ تمثیل تو مائی تھی۔ ناری تمثیل بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءً
حَلِيَّةٍ اَوْ مَتَاعٍ مَرَّ بَدَاً مِثْلُهُ ط

اور یہ جو (لوگ) زیور یا دوسرے سازو سامان کے لئے (معدنیات کو)
آگ میں تپاتے ہیں اس میں (بھی) اسی طرح جھاگ اُٹھتا ہے۔

معدنیات جب آگ میں پگھلائی جاتی ہیں تو ان میں سے سیل کا جھاگ اُٹھتا ہے۔ اسل جو ہر نیچے رہ جاتا ہے جو انسانی ضروریات زندگی کیلئے
کار آمد ہے اور جھاگ اوپر اُڑ کر چھنٹ جاتا ہے اور سوخت ہو جاتا ہے۔ ایمان و ہدایت کا معاملہ بھی ایسا ہی کچھ ہے ایمان کی گرمی جب پہنچتی ہے تو
مومن کے قلب کو اپنے اندر کی کثافتوں کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ پریشان ہونے لگتا ہے مگر یہ آگِ شہادت اور شہادت کی گندگیوں کو
اس طرح چھانٹ کر پھینک دیتی ہے جس طرح بھیڑی کی آگ معدنیات کے میل اور زنگ کو۔ پھر جس طرح ملاوٹ نکل جانے اور سوخت ہونے
کے بعد معدنیات کا خالص جوہر انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اسی طرح نورِ ایمان بھی قلبِ مومن میں منکسر ہو کر نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ذریعہ
سے ایک جہان کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

۳۔ دنیوی زندگی اور صاحب دنیا کی مثال

دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً ہم نے آسمان سے پانی برسایا اور اس سے زمین کی نباتات جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں۔ سیراب ہوئی یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار کر لیا اور خوشنما ہو چکی اور اھل زمین نے سمجھ لیا کہ اب وہ ان کی ہے تو (ناگاہ) ہمارا حکم اس پر رات یادن کے وقت نازل ہو گیا اور ہم اس کو ایسا بلیا میٹ کیا کہ گویا کل اس کا نام و نشان ہی نہ تھا۔ جو لوگ سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کے لئے ہم اپنی نشانیاں اسی طرح تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَاتَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرٌ نَالِكٌ أَهْطَرًا فَبَعَثْنَا هَهَا حَصِيدًا كَانَتْ لَوْ تَخَنُ بِالْأَمْنِ كَذَلِكَ لِنُقَضِّمُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ۔

(یونس - ۳)

یہاں اللہ تعالیٰ نے دنیوی زندگی کی تشبیہ اس طرح دی ہے کہ دنیا جب زیب و زینت کے لباس میں بن سحر کر سامنے آتی ہے تو انسان اس پر مفتون ہو جاتا ہے اور حصول دنیا ہی اپنا مطلق نظر قرار دے لیتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ فریب نفس اُسے یہاں تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اس زینت حیات کو اپنے قبضہ قدرت میں سمجھنے لگتا ہے اس وقت یکا یک کر شتمہ الہی نمودار ہوتا ہے اور اس کے ہاتھوں موت کے ذریعے سے یہ محبوب ترین متاع چھین کر اسے خمران و ناکامی کی ناگہانی مصیبتوں اور حیرتوں میں جھوڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت زندگی کی تشبیہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے دی ہے جس پر بارش کی کرشمہ سازی سے نباتات کی ہری ہری چادریں بچھ جاتی ہیں اور اس باصرونواز منظر کو دیکھ کر کسان بے خود و بے اختیار ہو جاتا ہے۔ اُس وقت خدا اُسے یاد نہیں آتا، نفس کے فریب میں آکر وہ اسے اپنے تدبیر کا نتیجہ اور اپنی ہلک سمجھنے لگتا ہے کہ اچانک حکم الہی جاری ہوتا ہے اور یہ سارا سامان غرور آفات و حوادث کی نذر ہو کر رہ جاتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے اس کا ظلم و غرور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے دکھائی دیتا ہے کہ جس جگہ اس کے خوش آمد تخیلات کی حسین عمارت قائم تھی وہاں شکستہ کھنڈوں کے نشان بھی اب موجود نہیں ہیں، یہی حال دنیا کی رعنائیوں اور اس کے پُر امیر اور خود فریب پرستاروں کا ہے۔ اگر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ دنیا اور دنیا پرست کا کتنی بلیغ تشبیہ ہے۔

ضمناً ایک اور نکتہ بھی سمجھ لو، چونکہ دنیا آفات و حوادث کا مرکز اور اس کے بالمقابل جنت الطینان و سکون اور عافیت و سلامتی کا گہوارہ ہے۔ اس لئے قرآن اس تنبیہ اور تذکیر کے بعد "وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى دَارِ السَّلَامِ" کہہ کر جنت کی زندگی کی طرف بلاتا ہے، جنت دارالسلام (سُکھ کا گھر) کہنے کی وجہ یہی ہے کہ یہ مقام اُن تمام آفتوں، پریشانیوں اور بے اطمینانیوں سے مامون ہے جن کی شکار دنیا بنی ہوئی ہے قرآن بلا لحاظ خاص و عام سب کو اس سلامتی کی طرف دعوت دیتا ہے کہ عدل الہی اس کا مقتضی ہے اگرچہ ہدایت و معرفت کی سعادت صرف انہیں کو حاصل ہوتی ہے جن کو پروردگار عالم اس عزت و شرف سے نوازتا ہے۔ وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ

۴۔ مشرکین کے معبودوں کی بے بسی کی مثال

جن لوگوں نے خدا کے ہوا دوسروں کو اپنا کار ساز بنا رکھا ہے۔ ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اُس نے ایک گھر بنایا اور کچھ شرک نہیں کہ سب گھروں میں کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے، کاش یہ لوگ جانتے

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بِعْتَصَافٍ أَوْ هَنْ أَلْبُيُوتٍ لَبِئْسَ الْعَنْكَبُوتُ لَوْ كَانُوا يَحْكُمُونَ ۚ

یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ مشرکین تو مکہ کی طرح کمزور و ناتواں ہیں لیکن ان کے اولیاء و شرکاء ان سے بھی زیادہ بیکار اور مجبور محض ہیں، سوان مشرکین کی ذاتی کمزوری و بے چارگی اور پھر اپنے سے بے بس تر اولیاء سے مدد و قوت حاصل کرنے کی مثال مکہ کی اور اس کے گھر کی سی ہے۔ اس مثل کے تحت مشرکین کے انتہائی خسران کا ذکر ہے کہ اگرچہ بے یار و مددگار ہیں لیکن وہ اپنی محرومی اور کمزوری کے نقطہ کمال پر اس وقت پہنچے جب کہ انہوں نے اپنے سے بھی زیادہ مجبور و غلوطی کو اپنا ولیٰ مددگار بنایا جن سے وہ سوائے ضعف و خسران کے کچھ نہیں پاسکتا اگر یہ سوال کیا جائے کہ مشرکین و کفار بھی جانتے ہیں کہ تار عنکبوت کمزور ترین شے ہے، پھر اس سے "لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ" کے ذریعہ ان کی واقفیت و علم کی نفی کیوں کی گئی ہے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے۔ آیت کا مقصد ان کے اس علم کی نفی کرنا نہیں ہے کہ مکہ کی گھر سب سے زیادہ کمزور ہے بلکہ اسی علم کی نفی کرنا ہے کہ خدائے واحد کے ہوا جو معبود اور اولیاء ٹھہرتے جاتے ہیں، ان کی قوت اور قدرت تار عنکبوت سے زیادہ نہیں ہے، اگر وہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے تو ایسا ہرگز نہ کرتے، وہ تو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یہی اولیاء ان کو قوت و جبروت بخشیں گے لیکن اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے اور نہ کبھی ثابت ہوئی۔ اس مضمون کی بکثرت آیتیں ملتی ہیں جن میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن کہتا ہے:۔۔۔۔۔

<p>وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۚ كَلَّا سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِغَالًا ۝ (مریم - ۵)</p>	<p>انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے الہ بنا رکھے ہیں کہ وہ ان کے مددگار ہوں گے، مگر وہ ہرگز مددگار نہ ہوں گے، قریب ہے کہ وہ خود ان کی بسندگی کا انکار کریں گے اور اُلٹے ان کے دشمن ہو جائیں گے۔</p>
--	--

دوسری جگہ ہے:۔۔۔۔۔

<p>وَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ إِلَهَةً لَعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَ هُوَ هَاجِدٌ ۝ (البین - ۵)</p>	<p>ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے الہ بنائے یہ سمجھ کر کہ وہ ان کی مدد کریں گے، مگر وہ ان کی مدد نہیں کر سکتے بلکہ یہ بت پرستوں کے لشکر میں سے ہوئے قیامت میں خود جواب دہی پھیلے حاضر ہوں گے۔</p>
---	---

ایک مقام پر مشرکین کی ہلاکت و تباہی بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:۔۔۔۔۔

<p>وَ مَا ظَلَمْنَا هُمْ وَ لَكِنْ ظَلَمُوا أَلْفُسَهُمْ ۚ فَمَا أَصْنَعْتُ عَنْهُمْ إِلَّا هُمْ وَ أَتَى يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ إِنِّي لَشَاقِءٌ ۚ أُمِرْتُ أَنْ أَدْعُوَهُمْ غَيْرَ مُتَّبِعٍ ۚ (نور)</p>	<p>اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور جب تیرے پروردگار کا حکم (عذاب) آیا تو خدا کے ہوا وہ جن معبودوں کو پکارا کرتے تھے وہ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے (بلکہ) انہوں نے ان کی تباہی کچھ اور بڑھادی۔۔۔۔۔</p>
---	---

ان چاروں مقامات پر حقیقت آشکارا کی گئی ہے کہ جس نے خدا کو چھوڑ کر شرکاء اور اولیاء کا دامن سہر بندی و سہر فرازی اور نصرت و امداد حاصل کرنے کے لئے پکڑا وہ ناکام رہا اور اس کی یہ عبادت مفید و منفعت بخش ہونے کے بجائے الٹی و بال جان بن گئی، یہ مثل جو اوپر بیان ہوئی شرک کے ابطال، مشرکین کے خسران اور ان کے انجام کی ہولناکی اور تباہ کاری کی سب سے زیادہ روشن اور بلیغ تمثیل ہے۔

۵۔ کفار کے اعمال کا اور ان اُمیدوں کا جو انہوں نے اپنے اعمال کے نتیجہ سے البتہ کر رکھی ہیں۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ يَتْبَعُهَا يُخْسَفُ ۚ وَ هُمْ فِيهَا شَرِبُوا ۚ (نور)

کریں اور کثرت سے کریں کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بار بار تلاوت کرتے اور اس میں بار بار ڈوبنے اور غواصی کرنے سے لمعات (FLASHES) قلب و ذہن کی سطح پر دمک جاتے ہیں جو عام حالات میں ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کو قرآن حکیم نے اپنی زبان میں یوں فرمایا ہے —

انّہ لقوآن کریمو، فی کتاب مکنون، لا یستہ الا المظہرون (الواقعہ، ۶۹)
یہ ذی شان قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب میں پہلے دن سے درج ہے جسے بحر پاک نہاد لوگوں کے دوسرے کوئی چھو نہیں سکتا۔
ہدیٰ للستقین (البقرہ ۲)
یہ کتاب ہدایت ہے اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے —

تِلْكَ اٰیٰتِ الْكِتَابِ الْحَكِيْمِ ۝ هٰدِیْ وَرَحْمٰةٌ لِّلْمُحْسِنِیْنَ (لقمان)
یہ ایک حکیمانہ کتاب کی آیات ہیں جو نیکوکاروں کے حق میں ہدایت و رحمت ہے یعنی اس کے فہم و ادراک کے لیے جو ارج کے ساتھ ساتھ قلب و ذہن کی طہارت بھی ضروری ہے۔ اتنا بھی لازم ہے اور عملی زندگی میں نیکی معروفت اور اسی شے کا ہونا بھی واجب ہے جسے ہم احسان کہتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ آپ کی صبحیں اور شامیں اگر قرآن کے پیغام دعوت و اصلاح کے ساتھ ہم آہنگ نہیں بھر آپ ایک کتاب کو تو سمجھ سکتے ہیں قرآن کو نہیں —



ریت کی سی ہے جیسے پیاسا دُور ہے دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب اس کے قریب آیا تو کچھ نہ پایا، البتہ اس نے اللہ کو وہاں موجود پایا جس نے اس کا حساب چوکا دیا اور اللہ پہل بھر میں حساب لے لینے والا ہے، یا ان کے اعمال کی مثال ان تہ بہ تہ تاریکیوں کی سی ہے جو ایک ایسے اتحادِ نمندر میں ہیں جسے موج نے ڈھانک رکھا ہو، پھر اس موج کے اوپر بھی بادل چھایا ہو۔ غرض ایک کے اوپر کئی تاریکیاں جمع ہیں کہ اگر کوئی آدمی اپنا ہاتھ لگا لے تو اسے بھی دیکھ پائے اور جسے اللہ ہی روشنی (ہدایت) نہ دے۔ اسے کہیں سے بھی روشنی نہیں مل سکتی۔

الظِّلْمَانُ مَاءٌ مَّحْتَمٍ إِذَا جَاءَهُ لَا لَوْ يَجِدُ شَيْئًا
وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ لَا قُوَّةَ لَهُ حِسَابُهُ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ
أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي جَحِيمٍ يُخَشَى أَنْ مَوْجُجٌ مِنْ فَوْقِهِ يَكُونُ
إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَا يَكُونُ يَدَهُ يَرَاهَا وَمَنْ لَوْ
يَجْعَلُ اللَّهُ لَهُ نَوْمًا فَأَمَّا لَهُ مِنْ تَوْبَةٍ

(نور - ۵)

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں دو مثالیں بیان فرمائی ہیں، ایک دُور سے چمکتی ہوئی ریت کی، دوسری تہ بہ تہ تاریکیوں کی، اس کے حق و ہدایت سے اغراض کرنے والے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:۔

ایک تو وہ لوگ جنہیں اپنے اوہام و ضرافات کی ہمت یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ بے بنیاد نہیں ہیں بلکہ کوئی نہ کوئی بُنیا در کھتے ہیں لیکن جب حقیقت بے نقاب ہوتی ہے تو ان کے گمان کی اہمیت آشکارا ہو جاتی ہے اور خیالات و اوہام کا تار پود بگھر جاتا ہے، جاہل بدعتیوں اور ہوا پرستوں کا یہی حال ہے کہ یہ لوگ اپنے اہوار و آراء کو علم و بصیرت اور رُشد و ہدایت سمجھ رہے ہیں لیکن جب اصل حقائق ان کے سامنے آتے ہیں اس وقت ان پر ان کے ظن بے بنیاد کار زکھلتا ہے اور واضح ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور ان کے اعمال کی یہ عمارت جو ان بے اصل عقائد کی بنیاد پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ہوئی ریت جو دُور سے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں پانی نظر آتی ہے اور حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ یہی کیفیت اور یہی انجام ہے ان اعمال کا جو نہ اللہ کے لئے کئے گئے ہیں نہ احکامِ الہی کے اتباع میں، ان اعمال کو صاحبِ عمل سمجھتا اور نود و بہود کا ذریعہ سمجھتا ہے حالانکہ اس غلط توقع کا انجام حسرت کے سوا کچھ نہیں۔ یہی وہ اعمال ہیں جن کی بابت حتمی وعدہ بلیغ فیصلہ ہے کہ وَقَدْ مَنَّ آلِي مَاعِمْلُو مِنْ عَمَلِكُمْ فَجَعَلْنَا لَهُمْ مَاءً مَشْتَوِيًّا (پ ۱۹-۱۸)

تشبیہ کی بلاغت پر غور کرو! اللہ تعالیٰ نے سراب کے ساتھ "بالقیح" کی قید بھی لگائی ہے، قیح اس چٹیل میدان کو کہتے ہیں جہاں حیوانی اور نباتی وجود کا نام و نشان تک نہ ہو یعنی محلِ سراب اس سنانِ صحرا کو بتایا ہے جو بالکل بے آب و گیاہ اور ہر غیر جمادی وجود سے خالی ہو، اور خود سراب ایک ایسی شے ہے جو بالکل بے حقیقت و بے اصل ہے۔ اب ان کے اعمال اور قلوب کو، جہاں لُذہدایت کی کسی کمرنگی کا گدڑ ممکن نہیں، سراب اور اس کے مذکورہ بالا موقعِ دمل سے مطابقت دو، کیسی چول سے چول بیٹھ جاتی ہے جس طرح اس محلِ سراب میں کسی چیز کا وجود نہیں۔ اسی طرح ان کے دلوں میں آفتابِ ہدایت کی کبرلوں کا کوئی گدڑ نہیں اور جس طرح سراب کی کوئی حقیقت نہیں اسی طرح ان کے دلوں میں آفتابِ ہدایت کی کبرلوں کا گدڑ نہیں تو قعات تو بہت ہیں مگر وقت پران کے لئے سراب کی طرح معدوم الحقیقت ثابت ہوئے۔ پھر یَحْسَبُونَ الظِّلْمَانِ هَاءً کی قید مزید پر غور کرو "ظلمان" اس شخص کو کہتے ہیں جو سخت پیاسا ہو۔ ایسا شخص پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر چمکتی ہوئی ریت کو پانی سمجھ کر پاس آتا ہے اور وہاں کچھ نہیں پاتا بلکہ شرمیلی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کفار کا یہی حال ہوگا، ان کے اعمال غیر اللہ کے لئے ہونے اور اطاعتِ رسول پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے بالکل سراب کے مشابہ ہیں جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف پانی سمجھ کر پکڑتا ہے اور نہ گہانی پاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح میدانِ حسرت میں کفار نہایت احتیاج کی حالت میں بڑی اُمیدوں

کے ساتھ اپنے اعمال کی طرف بڑھیں گے لیکن اعمال کا کہیں نام و نشان نہ ہوگا، البتہ خدا موجود رہے گا اُن کا حساب پُرکڑے گا۔ ہر باطل پرست کا یہی حال ہوگا یعنی باطل اس کے ساتھ اُس وقت دفا کرے گا جب کہ اُسے مدد کی سخت ضرورت ہوگی، کیونکہ باطل کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی اس کا سٹی بھی دلیا ہی باطل ہوتا ہے، جیسا کہ اس کا اسم۔ پس جب اعتقاد میں حق کی مطابقت نہ پائی جائے گی تو اس سے جو چیز متعلق ہوگی وہ بھی باطل ہوگی۔ اسی طرح عمل کی غرض و غایت اگر باطل ہو، مثلاً عمل خالصتہ لوجہ اللہ نہ ہو یا احکام الہی پر مبنی نہ ہو تو وہ باطل ہوگا اور عمل کرنے والا اپنی توقع کے خلاف اس کی بدولت مضرت سے دوچار ہوگا۔ نیز اس کے اعتقاد و عمل کی طرف سے غفلت نہ ہوگی کہ مالہ و علیہ کا فرق و امتیاز کئے بغیر فیصلہ ہو جائے بلکہ اسے نفع سے محروم رہنا اور مضرت و عذاب کا مزہ چکھنا ہوگا۔

وَدَّ جَدَّ اللّٰہِ سَعْدًا فَوَقَّہُ حَسَابًا ۖ وَ اللّٰہُ سَمِیعٌ عَلِیْمٌ (نور - ۱۵)

یہ اس گم کردہ راہ جماعت کی تصویر و تمثیل تھی جس نے غلط گمان کی وجہ سے اپنے آپ کو ہدایت اور راہِ راست پر سمجھتا تھا۔ اب مُسکّرین حق کی دوسری قسم کو لو، جس کے حالات کی تشبیہ ظلماتِ بحر سے دی گئی ہے یہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو حق اور شر و ہدایت کو جان پہچان نہ کر سکتے ہیں اور باطل ہی کی تاریکیوں کو اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر ایک دُور نہیں کسی طرح کی تاریکیاں چھا جاتی ہیں۔ ایک طرف سے فطرت کی ظلمت کا شکار ہوتے ہیں۔ دوسری طرف رُوح کی ظلمت کا تیسری سمت سے جہل کی تاریکی مسلط ہوتی ہے (کیونکہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، انجام کار جہل کا زنگ ان پر بیٹھ جاتا ہے) اور چوتھی طرف اتباعِ ہوا کی۔ ان تہ بہ تہ ظلمتوں میں گھبر جانے کے بعد ان کا حال بالکل اس شخص کے مشابہ ہو جاتا ہے جو ایک ایسے دریائے ناپید کنار میں جا پہنچا ہو جس میں لہروں لہریں اُٹھ رہی ہوں اور ساتھ ہی اُوپر سے سیاہ بادلوں کی تاریکی بھی اس پر چھائی ہوئی ہو۔ یعنی اس پر تین طرح کی تاریکیاں بیگ وقت چھائی ہوئی ہوں۔ دنیا کی تاریکی، مومنوں کی تاریکی اور باطل کی تاریکی۔ غور کرو، انہیں تاریکیوں کے مشابہ کفار کے قلوب کی تاریکیاں بھی ہیں۔ فطرت کی تاریکی، رُوح کی تاریکی اور دماغ کی تاریکی۔

سراب (جسے دُور سے پانی یعنی مادہ حیات سمجھا گیا ہے) اور ظلمات (جو نور کی ضد ہے) کی دونوں مثالیں ان دونوں (نارسی و مانی) مشلوں کے مشابہ ہیں جو منافقین اور سونہین کے بارے میں اُوپر بیان کی جا چکی ہیں۔ اور جن میں مومنین کا حصہ ”زندگی“ اور ”نور“ دکھایا گیا ہے اور منافقین کا حصہ ان کے برعکس ظلمت اور موت کی ہولناکی بتائی گئی ہے۔ یہی حالت مُسکّرین و منافقین کی زیرِ بحث مشلوں میں بھی بیان ہوئی ہے کہ پانی کی تلاش میں انہیں سراب بھلا جو دھوکے سے پانی نظر آ رہا تھا اور جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی، اسی طرح نور کے بجائے ظلمت جو ایک طرح کی رُوحانی موت ہے، ان کے مقدر میں لگی۔

بشرک کی ناقولیت کی مثال

اللہ تمہارے سامنے خود تمہارے اپنے ہی حال سے ایک مثال بیان کرتا ہے جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا ان میں سے کوئی بھی اس مال میں جو تم نے تم کو دے رکھا ہے۔ تمہارا شریک ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر کا حق رکھتے ہو اور ان سے بھی دلیا ہی اندیشہ رکھتے ہو۔ جیسا اپنے (جیسے آزاد حق تصرف رکھنے والوں) ایسا ہی تم کچھ والوں کے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتے ہیں۔

ضَرَبَ لَکُمْ مَثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ هَلْ لَّکُمْ مِّنْ مَّالٍ مَّالَکْتُمْ اَیْسًا لَّکُمْ مِّنْ شُرَکَآءَ - - - - -
فَیْمَا رَزَقْنَا کُمْ فَاَنْتُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ مَّا تَخَافُوْنَہُمْ
کَیْفَیْتُمْ اَنْفُسَکُمْ کَذَٰلِکَ نَفَصِّلُ
الْآیَاتِ لِقَوْمٍ یَّحْقِلُوْنَ - (رُوم - ۴)

آیت کریمہ میں جس دلیل سے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے بے بنیاد مسک کے خلاف استدلال کیا ہے اسے اصطلاح میں دلیل قیاس کہا جاتا ہے۔ استفہاماً ان کے غلاموں کو ان کا شریک و سہیم قرار دے کر ان کے خلاف ایسی جہت قائم کی ہے جس کی صحت کے وہ کلی طور پر ایسے معترف ہیں کہ ان کے دماغ میں کبھی اس کی غلطی کا دم بھی نہیں گذرتا۔ اور یہ دلیل وجہت کا بہترین و طبع ترین اسلوب ہے کہ مخالف پر خود اسی کے مسلمات اور بدیہی کلیات سے جہت قائم کی جائے، اللہ تعالیٰ ان نادان انسانوں سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ تمہارے یہ غلام اور لونڈیاں جو تمہارے دست تصرف میں ہیں کیا یہ تمہارے مال و متاع میں شریک ہیں؟ کیا اپنے ان مالیات کے متعلق تم یہ تصور کر سکتے ہو کہ تمہاری جائیداد میں یہ مساویانہ حصہ داری رکھتے ہیں؟ اور اس تصور کے تحت تمہارے دلوں میں کبھی یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ کبھی وہ تمہارے مال و متاع میں سے اپنا حصہ بلا لیں گے یا اپنے حصہ سے زائد تمہارا حق بھی مالیں گے۔ جس طرح کہ ایک شریک دوسرے شریک سے عموماً خوف و بے اطمینانی محسوس کیا کرتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تَحَاوُھُمْ کَحَیْفَتِکُمْ کی تادل یہ فرمائی ہے کہ کیا تم کو ان غلاموں سے یہ اندیشہ اور خوف ہے کہ وہ تمہارے مال و اسباب کے وارث ہو جائیں گے۔ جس طرح کہ تم میں سے بعض کو بعض کے ترکہ میں حق وراثت حاصل ہوتا ہے؟ بہر کیف آیت کا مقصد یہ ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اس بات پر راضی ہوگا کہ اس کا غلام اس کے سرمایہ اور اصل و اولاد میں شریک ہو جیسا کہ اس کے برابر حق تصرف رکھے اور اس حق تصرف کی وجہ سے اسے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں وہ (غلام) موقع پاکر ساری ملکیت پر تنہا قابض ہو جائے جیسا برابر کے شریک میں یہ خطرہ ہر دم موجود رہتا ہے؟ اگر تم اس پر راضی نہیں اور نہ کبھی ایسی نامعقول بات تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو تو پھر وہی بات میرے لئے کیوں پسند کرتے ہو؟ اور میری مخلوقات کو، جو میرے خلق غلامی میں ہیں، کیونکر میرا ہمسرا و ہم پایہ قرار دیتے ہو؟ اور جبکہ غلام و آقا کی اس مساوات کے تختل کو تمہاری عقل اور فطرت بدستہ غلط سمجھتی ہے (حالانکہ تمہارے حق میں اس کا بہت کچھ امکان بھی ہے۔ اس لئے کہ حقیقت کے اعتبار سے تو تمہارے غلام تمہاری ملک کسی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ دراصل وہ تمہارے بھائی ہیں برابر کے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں قبضہ اقتدار میں لے رکھا ہے، اس لئے محض فرضی طور پر نہ کہ حقیقی طور پر دونوں کے مرتبہ جداگانہ ہو گئے ہیں اور دونوں کو مجازاً "آقا" اور غلام کے الگ الگ نام مل گئے ہیں، ورنہ حقیقتاً تم اور تمہارے غلام دونوں کے دونوں ہی کی اور ہی حقیقی آقا کے غلام اور بندے ہیں۔ تو میرے حق میں تمہارا ضمیر اسی تختل کے تسلیم کرنے کی اجازت کیوں کر دیتا ہے حالانکہ وہ تمام کے تمام میرے ہی بندے، میری ہی ملکیت اور میری ہی مخلوق ہیں جن کو تم نے میرا ہم پایہ و ہم مرتبہ اور شریک بنا رکھا ہے؟ یہ ہے تفصیل آیات، یعنی كَذَٰلِكَ لَفَصَّلَ الْاٰیٰتُ کا مطلب۔

۹۔ الباطل شرک کی مثال

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهَنَ وَزَفَنَ مِمَّا رَزَقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُونَ ط الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ هُمُولًا يَعْلَمُونَ ۝ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا مَّرْجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكُورًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَا ۝ لَا يُؤْمِنُ آيَاتِ رَبِّهِ وَهُوَ بِغَيْرِ هَدًى يَسْتَوِي هُمَا لَا يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

خدا نے ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے دوسرے کی ملک جو کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرا شخص ہے (خود مختار جس کو ہم نے اپنی سرکار سے اچھی روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے کچھ چھپ کر اور کچھ کھلے طور پر خرچ کرتا ہے۔ کیا ایسے دو شخص برابر ہو سکتے ہیں؟ (یہ مثالیں سن کر مشرکین ضرور نہیں ہلکا رہیں گے) الحمد للہ (کہ اتنا تو سمجھ لیکن ان میں سے بہترے ایسے بھی ہیں جو اتنا بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور خدا نے (ایک دوسری) مثل دو آدمیوں کی بیان فرمائی ان میں کا ایک گورگا (اور کسی کا غلام بھی) ہے جو کچھ

نہیں کر سکتا (نیز) وہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی کہ جہاں کہیں اس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور وہ جو عدل کا حکم کرتا ہے اور خود بھی سیدھی راہ پر ہے کیا برابر ہو سکتے ہیں —

ان آیات میں قرآن نے دو مثالیں بیان کی ہیں اور دونوں میں استدلال کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جسے اصطلاح میں قیاس عکس کہا جاتا ہے، یعنی کسی شے سے علتِ حکم کی نفی کر کے اصل حکم کی نفی کرنا، کیونکہ قیاس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک تو قیاس عام جس میں نفی علت کی وجہ سے فعلِ اصل کے حکم کی نفی کی جاتی ہے۔ یہاں اسی طرز استدلال سے زیر بحث مثلوں میں کام لیا گیا ہے —

پہلی مثال اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت اور شانِ ملکیت اور بقول کے عجز اور بے کسی کی دی ہے اور بخت پرستی کی نامعنویت پر روشنی ڈالی ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ عالم کی تمام اشیاء کا مالکِ مطلق اور ذرۂ ذرہ کا فرما زو ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے معنی طور پر اور کھلے بندوں میں شب و روز اپنے بندوں کو انواع اقسام کی نعمتوں سے نوازتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بے مد و حساب دے ڈالتا ہے۔ اس کا خزانہ رزق اتنا وسیع اور لا محدود ہے کہ شمار و زکریٰ پریم بخششوں اور فیاضیوں کے باوجود بھی کم ہونے والا نہیں، اس کے عکس امتیاز و امتنان ایک محکوم اور در ماندہ مخلوق ہیں۔ جن کو کسی چیز پر بھی قدرت و اختیار نہیں — تو مشرکین کو کیا ہو گیا ہے کہ اس عظیم الشان اور روشن از آفتاب فرق کے باوجود کہ میں قادر مطلق ہوں اور یہ بخت محض، میں مالک ہوں اور یہ مملوک، وہ کس طرح ان بے بس اور در ماندہ مورتیوں کو میرا شریک و ہمتا سمجھتے ہیں اور مجھے جھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں —

آیت زیر بحث کا دوسرا لکھڑا یہ ہے :-

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَّاجِلَيْنِ أَحَدُهُمَا
أَبْكُورًا يُقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا
يُوجِهَهُ لَا يَأْتِي بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ
يَتَّخِذُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

اور اللہ — دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان میں سے ایک گولنگا ہے، کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اپنے مالک پر بارِ عجز اسے جہاں کہیں بھیجتا ہے کوئی فائدہ حاصل کر کے نہیں لوٹتا کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہے جو عدل و قسط کا حکم دیتا ہے اور سیدھے راستے پر ہے —

اس آیت میں اللہ اور غیر اللہ یعنی معبودِ حقیقی اور معبودِ باطل کی مثال بیان کی گئی ہے، معبودِ باطل کی مثال تو اس گولنگے آدمی کی سی ہے جو قوتِ عقل اور گویائی دونوں سے یکسر محروم ہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو دل اور زبان دونوں گولنگا ہو، اور پھر اس کے عجز و ناتوانی کا حال یہ ہو کہ کوئی بھی کرنے کی قدرت اس میں نہ ہو، خواجگی و آقائی کرنا تو درکنار، کم بخت بندگی اور غلامی کرنے میں اتنا گھٹیا ہو کہ اس کا آقا اس سے کوئی بھلا کام نہ لے سکے۔ ان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی مثال اس شخص کی سی ہے جو عمران اور کار فرما ہو معبودِ باطل بے حیات ہیں عاجز و در ماندہ ہیں۔ بندگی میں بھی گھٹیا درجہ پر ہیں، بخلاف اس کے اللہ نہ صرف ذی حیات ہے، بلکہ موجدِ حیات ہے۔ عاجز نہیں —

اللہ سیدھے راستے پر ہے اس کا مفہوم :-

میں نے اللہ پر بھروسہ کیا ہے جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے، ہر چلنے والے جاندار کی پیشانی اسی کے ہاتھ میں ہے بیشک میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے —

إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِأُصْبُعِهِ إِنْ رَبِّي عَلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ٥

”خدا سیدھے راستے پر ہے“ اس جملہ کی گہرائیوں میں اُترو اور دیکھو کہ اس کی تہ میں کتنے انوار پوشیدہ ہیں، سیدھے راستے پر ہونے کا اقتضا ہے کہ وہ جو کچھ فرماتا ہے حق فرماتا ہے، جب حکم دیتا ہے عدل ہی کا حکم دیتا ہے۔ جو کچھ کرتا ہے مصلحت، حکمت، رحمت اور عدل کے حدود سے باہر ہو کر نہیں کرتا، مختصر یہ کہ قول اور فعل دونوں لحاظ سے حق پر ہے۔ پس ناممکن ہے کہ اپنے کسی بندے پر ایک مہر مظلوم کا فیصلہ کرے یا بغیر کسی گناہ کے سزا دے، یا اس کی نیکیوں میں سے زبردستی کچھ کم کر دے یا دوسرے کے گناہ کا بوجھ خواہ خواہ اس پر ڈال دے، جنہیں نہ تو براہِ راست خود کیا ہو نہ اس کے لئے کسی حیثیت سے ذریعہ بنا ہو، غرضیکہ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا۔ جو اس کے لئے حمد و ثنا کا باعث نہ ہو اور اچھے اور مفید انجام اور عکمانہ مقاصد پر مشتمل نہ ہو کیونکہ اس کا صراطِ مستقیم پر ہونا ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے۔ محمد بن جریر طبری اسی جملہ کی تفسیر یوں فرماتے ہیں:۔

”ہمارا پروردگار طریقِ حق پر اپنے نیک اور محسن بندے کو اس کی نیکی اور احسان کا بدلہ دیتا ہے اور برے کو اس کی بُرائی کا کسی پر کوئی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی سے اسلام و ایمان کے مایہ دہی شے کو قبول کرتا ہے۔“

اس کے بعد اہم مجاہد کا قول نقل کرنے ہیں کہ صراطِ مستقیم سے مراد صراطِ حق ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جملہ آیت ”إِنَّ مَرَاتَبَكُمْ لَبِئْسَ لِمُؤْتَدٍ“ بیشک تیرا رتبہ گھٹات میں لگا ہوا ہے۔ کا ہم معنی ہے۔ مگر یہ اختلاف محض لفظی ہے ورنہ اس جماعت کے خیال کا حاصل بھی وہی ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے کیونکہ خدا کے گھٹات میں رہنے کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ وہ بُرے کو بُرا اور اچھے کو اچھا بدلہ دے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس جملہ میں مذف ہے اور اس کی تفسیر یوں ہے۔ ”اِنَّ مَرَاتَبَكُمْ لِيَحْشَكُوْهُ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ، وَيَحْضَكُوْهُ عَلِيْهِ“ یعنی میرا پروردگار تمہیں صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگر ان لوگوں کی اس مذف و تقدیر سے مراد یہ ہے کہ آیت کا مقصود بالذات مفہوم یہی ہے تو وہ غلطی پر ہیں۔ اس مقدر پر ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جسے وہ پیش کر سکیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ دو صفتیں بیان کی ہیں۔ ایک امر بالعدل کی، دوسری صراطِ مستقیم پر ہونے کی۔ امر بالعدل کے مفہوم و معنی میں وہ بات تو آئی گئی ہے یہ لوگ ”اِنَّ مَرَاتَبَكُمْ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ“ کے متعلق فرماتے ہیں پھر دوسرے ٹکڑے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہاں اگر ان کا مقصد اس مقدر کے ماننے سے یہ ہے کہ خدا کا صراطِ مستقیم پر نباتِ خود ہونا اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بھی اس کے لئے ترغیب دیتا ہے تو ان کا خیال صحیح ہے۔

ایک جماعت اس جملہ کی تفسیر یہ کرتی ہے کہ تمام امور اور ساری مخلوق کو خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ کوئی شے اس سے بچ کر نہیں نکل سکتی۔ سو یہاں بھی ہم وہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ جماعت اپنے اس قول کو آیت کا مخصوص معنی سمجھتی ہے تو برسرِ غلط ہے، ہاں اگر اسے اس آیت کے لوازم اور موجبات میں شمار کرتی ہے تو یہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

تفسیروں میں اس آیت کی ایک اور تاویل دیکھنے میں آتی ہے وہ یہ ہر چیز خدا کے قبضہ قدرت اور ملک میں ہے۔ بجائے خود یہ بات کتنی ہی حق سہی لیکن جس آیت کی تفسیر میں وہ پیش کی جاتی ہے۔ اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں۔ اس بات کے کہنے والوں نے یہ غور نہیں کیا کہ حضرت شعیب نے اپنے قول میں دو جملے فرمائے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے ”مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ آخِذٌ بِمِصْتَدٍ“ فرمایا ہے اس کے بعد ”اِنَّ مَرَاتَبَكُمْ عَلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ“ یہ دونوں جملے الگ الگ ہیں اور دونوں اپنے اپنے مستقل معانی رکھتے ہیں۔ ان میں سے پہلا جملہ خدا کی قدرت کی ہمہ گیری ظاہر کر چکا تھا، پھر اس جملہ میں اسی بات کو دہرانے کی کیا ضرورت تھی؟

والغرض اہم مجاہد کا قول صحیح ہے اور یہی اکثر ائمہ تفسیر کا خیال ہے۔ ادبی لحاظ سے اس کا دوسرا مطلب ٹھہرانا بہت مشکل ہے۔ اور اگر غور کرو تو معنوی اعتبار سے بھی یہ خیال نہایت بلند اور پاکیزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ”وہ جسے چاہتا ہے یعنی جس کے بائیں میں اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لے آتا ہے۔“ پس اگر خدا ہی وہ ذات ہے جس نے انبیاء اور ان کے تابع

کو قولاً وعلماً صراط مستقیم پر قائم کیا ہے۔ تو وہ اس امر کا اور زیادہ مستحق ہے کہ اپنے قول اور فعل کے اعتبار سے صراط مستقیم پر ہو۔ اور اگر ہدایت یا سب انسانوں کی صراط مستقیم اپنے رب کے احکام کی موافقت کا ہے خدا کی صراط مستقیم نام ہوگا۔ اس کے قول حق یا فعل حق کا جو اس کی شانِ حمد اور شانِ کمال کا مقتضا ہے۔

کلام باری تعالیٰ سے اور اس میں تدبیر کرنے سے اسراض کرنے والوں کی مثال :-

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ | ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نصیحت یعنی قرآن سے یوں بدکتے
كَانَ قَوْلُكُمْ مَنَاسِكَةً ۖ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ | ہیں جیسے جنگلی گدھے شیر سے ڈر کر بھاگتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور بلخِ تشبیہ ہے۔ قرآن سے بھاگتے ہی وہ لوگ ہیں جو اس کی حقیقت سے بالکل نااہل ہوتے ہیں۔ ان کی ہیئتِ نفسی ان جنگلی گدھوں کی کیفیتِ باطنی سے بالکل مشابہ ہوتی ہے جو کسی بات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے اور جب کسی چیز کی آہٹ پاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ شیر ہی ہوگا لہذا سر ہار پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح قرآن سے بھاگنے والے بھی اپنی حماقت سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بھڑا کھانے والی چیز ہے۔ حالانکہ یہ سرچشمہ خیر و سعادت اور منبع حیات ہے۔ پھر رازِ زندگی کو پیامِ موت سمجھنے والا گدھانہ ہوا تو اور کیا ہوا؟ ————— "مستفزة" کے لفظ میں جو بلاغت ہے وہ نافرہ کے لفظ سے ہرگز نہ پیدا ہو سکتی۔ نافرہ کے معنی صرف بھگانا والے کے ہیں لیکن مستفزة کے لفظ میں بھاگنے اور لے بھاگنے دونوں کا مفہوم شامل ہے جو یہ ظاہر کر رہا ہے کہ فرار کی شدت اتنی بے پناہ تھی کہ گویا ایک کا فرار اور دوسرے کے لئے بھاگنے کا باعث ہوا اور ایک نے دوسرے کو بھاگنے پر ابھارا۔ یہ لطف نافرہ کہنے میں میں پیدا نہ ہو سکتا تھا۔

غیبت کی مثال :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ
الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا
يَغْتَبَ بََعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنُ
يَنَاسِكَ لِلْحَمَةِ آخِيهِ مَيْتًا فَكُرِّهُمُوهُ وَالْقَوَا
لِللَّهِ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝

(المحجرات)

اے ایمان والو بہت زیادہ قیاس آرائیاں کرنے سے پرہیز
کرو، کیونکہ گمان و قیاس گناہ بھی ہو جاتا ہے، لوگوں کے حال کا
تجسس نہ کیا کرو، اور ایک دوسرے کی غیبت بھی نہ کیا کرو،
کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت
کھائے اور لوگ اس سے گھٹن کھائے لگیں؟ اللہ سے ڈرو!
بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کسی مسلمان کے پردہ ناموس کو ٹھوڑے ٹھوڑے کرنے کی تشبیہ اس کے گوشت کو پارہ پارہ کرنے سے دنیا قیاس تشبیہ کی کیسی بے نظیر مثال ہے جو نہ غیبت کرنے والا اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر اس وقت حملہ کرتا ہے جب وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا اس لئے اس کا حال بالکل اس شخص کا ہے جو کسی کی رُوحِ غائب ہو جانے یعنی مرجانے کے بعد اس کے جسم سے گوشت لوٹتا ہوا اور چونکہ وہ غریب اپنی اس غیبت سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ اس لئے وہ ہنزلہ اس بے جان لاش کے جس کی بوٹیاں کائی جا رہی ہوں اور وہ اپنی بچانے کی قدرت نہ رکھتی ہو۔ نیز چونکہ غیبت کنندہ دوسرے کی متاعِ عزت سے متمتع ہوتا ہے اور اس کی مذمت سے اپنے نفس کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس لئے اس کی تشبیہ گوشت کھانے والے کے ساتھ دی جو مردہ بھائی کی بوٹیاں چبا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے اور اس لحاظ

سے کہ وہ اس بدگوئی کو پسند بھی کرتا ہے اس کی تشبیہ اس شخص کے ساتھ دی گئی ہو اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند بھی کرتا ہو۔ ایجابِ احل کھانے الفاظ اس جرم کو اور زیادہ سخت بناتے ہیں، کراہیت کے ساتھ مُردہ کا گوشت کھانے سے بدرجہ یہ ہے کہ رغبت کے ساتھ کھایا جائے اور ظاہر ہے کہ غیبت کرنے والا آدمی اس غیبت سے لذت بھی لیتا ہے۔

گہری نظر سے اس تشبیہ کے موقع و محل اور اس کے محاسن پر غور کرو، معقول (مشتبہ) اور محسوس (مشتبہ یہ) میں کیسا کامل تطابق ہے پھر یہ بھی دیکھو کہ اندازِ بیان کیسا بیخ و بن اور متحرک ہے۔ بھائی کا گوشت نوح نوح کر کھانا طبعاً ہر شخص کو گھناؤنا معلوم ہوتا ہے اور تمام مخاطبین کے اندر اس فطری احساسِ کراہیت کا موجود ہونا یقینی ہے، لہذا پہلے تو ذرا اس احساس کی خود خبر دی پھر آیت کے آخر میں تمام مخاطبین کو اس وصف سے متصف قرار دیا (فَکَرِهْتُمُوْکُمْ) نیز اس سے قبل آیت کے شروع میں استفہامِ انکاری کے ذریعہ اس حقیقت کی مزید توثیق کر دی۔ (اَیْحَبُّ اَحَدٌ کُفْرًا) اس طرح ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے اس فطری احساس کو دماغ میں سمجھانے کے بعد ان پر اس امر کو واضح کیا کہ جب یہ شے تمہاری طبیعت کو گھناؤنی معلوم ہوتی ہے تو پھر کس طرح دمنے تمہیں مغربِ خاطر ہو سکتی ہے جو اسی کے مشابہ ہے؟ گویا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ایک ناپسندیدہ شے سے اس شے کے خلاف جنتِ قائم کی جو انہیں مغرب ہے۔ پھر شے مغرب کو اس شے نامغرب کے ساتھ تشبیہ دی جس سے انہیں کابلِ نفرت اور نہ کم ہونے والی کراہیت ہے پس عقلِ نفرت اور حکمت کا عام تقاضا ہے کہ وہ اس شے سے بھی ویسی ہی نفرت اور کراہیت رکھیں جیسی اس کی نظیر اور مثال سے رکھتے ہیں۔

اعمالِ کفار کی بے حقیقتی کی تشبیہ :-

جن لوگوں نے اپنے پروردگار کے سامنے کفر کیا ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے لو کے دن تیز ہوا اڑا لے جائے وہ اپنے کئے ہوئے اعمال میں سے کسی عمل (کا ثواب حاصل کرنے) پر قادر نہ ہوں گے۔ یہ ہے پرلے درجے کی ناکامی۔

مَنْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اَعْمَالُهُمْ كَوْمَادٍ
ذَاتُ شَتَاتٍ يَّزِيْدُ فِيْ يَوْمٍ عَصِيْفٍ لَا يَصْلَحُوْنَ
وَمَّا كَسَبُوْا عَلٰی شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الصَّوْدُ الَّذِي
الْبَعِيْدُ (ابراہیم)

یہاں اللہ تعالیٰ نے کفار کے باطل اور غیر نافع اعمال کو ایسی راکھ سے تشبیہ دی ہے جس پر تیز و تند ہوا کا گزر ہو۔ یعنی چونکہ ان اعمال کی نہ تو ایمان کی بنیاد پر تعمیر ہوئی نہ خدا کے لئے وہ کئے گئے تھے اور نہ ہی خدا کے حکم کے مطابق تھے۔ اس لئے خدا کے غضب میں بالکل ہی بے وزن اور بے حقیقت ٹھہریں گے، اتنے بے وزن کہ خدا نے ان کو اس راکھ کے مشابہ قرار دیا جسے بادِ صرصر ادھر سے ادھر اڑا لے جائے اور کوئی شخص اسے کام میں لانے پر قادر نہ ہو دراصل ایک وہ اس کا شدید حاجت مند بھی ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا ہے کہ :-

لَا يَخْلُدُ رُؤُنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰی شَيْءٍ ”یعنی جن اعمال سے وہ فلاح کی اتنی امیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ قیامت کے دن ان کی اپنی امیدیں اور ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہ ہوں گے اور وہ اعمال ان کے لئے کسی فائدہ اور ثواب کے موجب ہرگز نہ بنیں گے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صرف انہیں اعمال کو شرف قبولِ بخشش کا جو اس کے لئے اولیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت کے موافق ہوں اور ان لوگوں کا مال یہ ہوگا کہ ان کی کسبہ اعمال میں خلوص اور طاعتِ الہی کا ایک حب بھی نہ ہوگا۔

راکھ کے ساتھ ایسے غیر مقبول اعمال تشبیہ دینے میں ایک نہایت لطیف نکتہ مضمر ہے، راکھ کے مادہ کو کون سی چیز ذائل کو کے راکھ بناتی ہے؟ آگ اور ان کے اعمال کو کون سی چیز بے اصل اور بے وزن بنائے گی؟ وہ بھی آگ ہی ہوگی، کیونکہ جو اعمال ایمان باللہ اور اطاعتِ الہی کی روح سے خالی بنی ہوئے ہوں گے وہ دوزخ کی آگ کی خوراک نہیں گے۔ ہاں اللہ کے ہاں وہ اعمال بے ثمر ہوں گے۔

اور نعمت پیدا کرے گا جس طرح کہ وہ اپنے مخلص پرستاروں اور فرماں برداروں کے اعمال ہی سے ان کے لئے لذت اور نعمت پیدا کرے گا پھر آگ ان اعمال کو جلا کر خاکستر بنائے گی اور انجام کار یہ منکرین حق، ان کے اعمال اور ان کے سارے عبود آگ کے ایندھن ہو جائیں گے۔

کمال کے بعد لغزش کی وجہ - اور اس کے تمثیل :-

وَاقْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَاسْلَخَ مِنْهَا فَأَتَّبَعُ الشَّيْطَانَ فَكَانَ مِنَ الْمَلْحُونِينَ
وَلَوْ شِئْنَا لَكِرَفَعْنَا بِهِ وَابِلًا لَّكُنَّا فِي الْأَفْقِينَ
وَإَتَّبَعَهُ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصُصْ الْقِصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ • (اعراف ۲۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں کو اس شخص کی خبر بڑھ کر سناؤ جسے ہم نے اپنی آیات دی تھیں (لیکن اس نے ان پر عمل نہیں کیا) اور ان کی پیروی سے بچ کر نکل بھاگا، پھر شیطان نے اُسے آیا اور وہ گمراہوں میں شامل ہو گیا، اگر ہم چاہتے تو انہیں آیات کے ذریعہ سے اس کو اونچا اٹھاتے۔ لیکن وہ تو دنیا سے چبٹ گیا اور اپنی خواہش نفس کے پیچھے لگ گیا پس اس کی مثال کُتے کی سی ہے اگر اس کو جھڑکو، مارو، تو بھی اور اگر خاموش رہ کر اسے اس کے

حال پر چھوڑ دو تو بھی زبان باہر لٹکائے رہے۔ یہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی پس یہ قصے اپنے مخاطبین کو سناؤ تاکہ وہ غور کریں —

یہاں اللہ تعالیٰ نے علم ہدایت رکھنے والے دنیا پرست عالم کی مثال کُتے سے دی ہے۔ دونوں کی کیفیات کا تجزیہ کر کے دیکھو کہ دونوں کی فطرت میں کس قدر یکسانی پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو اپنا ہدایت نامہ (کتاب) دیتا ہے اُسے علم کی بخشش سے نوازتا ہے، لیکن وہ شکر بجا کر اس پر عمل کرنے کے بجائے اسے پس پشت ڈال دیتا ہے اور عمل کا ہر قدم خواہش نفس کی پیروی میں اٹھاتا ہے یعنی خدا کی ناراضماندی کو اس کی رضا پر اور مخلوق کو خالق پر اور چند روزہ دُنیائے دنی کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے، کُتے کی جبلت میں اس کے علاوہ اور کیا چیز ہے؟ اپنے پیٹ کے ہوا دنیا کی کمی چیز سے اسے سروکار نہیں، حرص و آز کا اس کی فطرت پر اس قدر کامل غلبہ ہے کہ چلتے پھرتے اس کی ناک بہر حال زمین سونگھنے میں لگی رہتی ہے کہ شاید پتھر کے بجائے نوالہ ہو، پیٹ کا بندہ لپکے اس کو بھی ایک دفعہ تو دانتوں سے پکڑ لیتا ہے۔ گویا اس کجمنت کے ذہن میں پیٹ اور کھانے کے ہوا کسی اور چیز کا تصور کبھی آتا ہی نہیں جس چیز کو دیکھتا ہے پیٹ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اسی حرص کا اثر ہے کہ جب ایک ٹمٹا کوئی بہت بڑی مردہ لاش پا جاتا ہے جو صد ہا کُتوں کے کھانے کے لئے کافی ہوتی ہے تب بھی وہ کسی دوسرے کُتے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتا۔ اس میں شریک نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا آن موجود ہوتا ہے تو بھونکنا اور کاٹنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ بھال جائے پھر اس دنات کے ساتھ ساتھ کس قدر ناپاک طبع اور گندہ فطرت ہوتا ہے کہ تازہ اور صاف کھانے کے مقابلے میں مڑر اور بدبو دار اشیاء کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ اپنے جسم کے سارے اعضاء کو جھوڑ کر بس اپنی شرمگاہ سے دلچسپی رکھتا ہے اور بار بار اسی کو سونگھتا رہتا ہے —

کُتے کی ان فطری خصوصیات کو سامنے رکھ کر دیکھو کہ جو شخص کتاب الہی کی ہدایت سے واقف ہو جائے اور اس کی صداقت کو جان لینے کے بعد عملاً اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کی حالت کُتے سے کس قدر مشابہ ہے۔ اپنے علم اور اقرار کے خلاف عمل کرنے پر جو چیز اسے مجبور کرتی ہے وہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی نفس پرستی کے ہوا اور کیا ہے؟ جب وہ پیٹ اور شہوت کا غلام بن جاتا ہے تب ہی تو خدا کو خدا ماننے کے باوجود اس کی بندگی سے انکار کرتا ہے۔ اس کے نفس میں کچھ عرصہ تک ایک کشمکش رہتی ہے۔ ایک طرف اس کا علم کھینچتا ہے اور دوسری

طرف اس کی خواہشات کھینچتی ہیں، آخر کار جب وہ علم کی رسی توڑ کر خواہشات کی طرف ٹوٹ پڑتا ہے تو اس کی حالت بالکل وہی ہوتی ہے جو اوپر کُتے کی حالت بیان کی گئی ہے پھر اس کو حلال سے زیادہ حرام کے ساتھ رغبت ہوتی ہے پھر اس کے دل اور دماغ کی جگہ بھی معدہ ہی لے لیتا ہے پھر وہ دنیا کی ہر چیز کو پیٹ کی آنکھ سے دیکھنے لگتا ہے۔ پھر اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ چار روٹیوں پر اس سے جس چیز کو چاہو قربانی لے لو۔ پھر وہ نوالہ کی توقع پر ہر ذلت برداشت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور پیٹ کے بعد اگر کوئی چیز اس کی دلچسپیوں کا مرکز ہوتی ہے تو وہ اس کی شرمگاہ ہے اس کا بس نہیں چلتا کہ ہم تن شرم گاہ بن کر رہ جائے۔

ابن جریر کا قول ہے کہ کتنا منقطع القلب ہوتا ہے اس کے اندر دل نہیں ہوتا، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سینہ میں وہ دل نہیں ہوتا جو اسے صبر اور وقار پر آمادہ کر سکے اور دنیا کی غلامتوں میں رُوح کو لتھڑنے سے روک سکے، بے صبری اور عشق دنیا کا وہ فور دونوں کی مشترک خاصیت ہے وہ اس وجہ سے دنیا پر ٹوٹا پڑتا ہے کہ اس کی طبیعت دنیا کے ہارے میں غیر معمولی بے صبری اور غیر قانع واقع ہوتی ہے اور یہ اس وجہ سے ہر آن زبان لگا لے رہتا ہے کہ حرم اور لالچ کی آگ اس کے کلیجہ میں ہر دم جلتی رہتی ہے۔ کُتے کی زبان لٹھنے سے باز نہ آئے گی، خواہ تم اسے مار پیٹ کر زبان منہ میں رکھنے پر مجبور کر دیا اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسی طرح جو انسان کُتے کی سی حالت میں مبتلا ہو اس کو تم خواہ وعظ و نصیحت کے ذریعہ خدا اور آخرت کا خوف دلاؤ، یا خاموش رہو ہر حال میں اس کا دل دنیا ہی میں پھنسا ہے گا۔

ابو محمد ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ ہر جانور بھوک یا پیاس کی شدت سے بدحواس ہو کر زبان نکالتا ہے مگر کُتے کا حال سب سے مختلف ہے۔ یہ آرم، تکلیف، تندرستی، بیماری، تشنگی، میرا بے غرض ہر حال میں زبان لگا لے رہتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی مثال کُتے ہی سے دی جو آیات الہی کو جانتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہیں اور پھر عملاً اس کی تکذیب کرتا ہے۔ اگر اس کو نصیحت کی جائے تب بھی وہ گمراہی کی دلدل میں پھنسا ہے گا۔ اور اگر نصیحت نہ کی جائے تب بھی، چنانچہ دوسری جگہ ایک آیت میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے

<p>وَاِنْ تَدْعُوهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ سَوَآءٌ عَلٰیْكُمْ اَدْعَوْتُمْهُمْ اَمْ لَمْ تَدْعُوْهُمْ اَمْرٌ اَنْتُمْ صَاحِبُوْنَ</p>	<p>اور اگر تم ان کو ہدایت کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پیروی نہ کریں گے، تمہارے لئے یکساں ہے خواہ انہیں حق کی دعوت دو، یا خاموش رہو۔</p>
---	--

اب اس مثل کے لئے جو الفاظ اور جملے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے اسرار و معانی پر ایک نگاہ ڈالو۔ سب سے پہلے آیتناہ آیاتنا کو دیکھو۔ خدا کہتا ہے کہ ہم نے خاص طور پر اس کو اپنی آیات دیں جو درحقیقت سب سے بڑی نعمت ہیں۔ اس بخشش نعمت کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس بخشش کی قدر و منزلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر معمولی سی نعمت ہوتی تو اوتی (اس کو آیت دی گئی تھیں) کہہ دیا جاتا۔

پھر فرمایا فَاَنْسَلَخْ مِنْهَا یعنی ان آیات کے احاطہ اور اقتدار سے اس طرح نکل بھاگا جس طرح سانپ اپنی کینجلی چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے۔ یا جس طرح کسی جانور کی کھال کھینچی جائے اور وہ گوشت سے الگ ہو جائے، دیکھو پہلے جملہ کی طرح یہاں خدا نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا، یعنی یہ نہیں کہا کہ ہم نے اسے اپنی آیات سے ڈور کر دیا، کیونکہ یہ تو دراصل انہی کی بدبختی کا فعل ہے۔ اور اپنی ہوا پرستی کی وجہ سے وہ خود ہی اس محرومی کا سبب بنا ہے۔ اس کے بعد آتا ہے "فَاتَّبَعْنٰ الشَّيْطٰنَ" یعنی شیطان نے اسے پالیا۔ "اتباع" کے معنی یہاں پالنے اور پکڑ لینے کے ہیں، چنانچہ قوم فرعون کے بنی اسرائیل کو پالنے کو اللہ تعالیٰ نے "اتباع" ہی کے لفظ سے ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "فَاتَّبَعُوْهُ مُشْرِقِيْنَ"۔ صبح کے وقت انہوں نے بنی اسرائیل کو جالیا، شیطان کا حملہ اس وقت اس پر کارگر ہوا جب وہ آیات الہی کو پس پشت ڈال چکا تھا۔ اس سے قبل وہ ان آیات کے مضبوط حصار میں مامون و مصنون تھا اور

کمی طرف سے بھی شیطان اس پر قابو نہ پاسکتا تھا اگر آنکو وہ کبھی غافل رہا ہو اور اچانک شیطانی فریب کا چند لمحوں کے لئے شکار ہو گیا ہو، لیکن جب اس نے آیات الہی کے اس حصار کو توڑ کر پھینک دیا اور اس سے آزاد ہو گیا تو شیطان نے اپنی کمین گاہ سے جھپٹ کر اسے اس طرح اپنے پنجوں میں داب لیا جس طرح اپنے شکار کو داب لیتا ہے۔ انجام کار وہ ان گمراہوں کے زمرہ میں شامل ہو گیا (فکان من الخاویں) جو حق کو پہچان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں اور علم ہدایت رکھتے ہوئے اس کے مطابق زندگی نہیں بسر کرتے یعنی علماء سوء۔

پھر فرمایا اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اٹھا کر اسے بلند یوں پر لے جاتے "وَلَوْ سِخَرْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَآءِ" یہاں خدا اپنا ایک قانون بیان کر رہا ہے کہ محض علم، خواہ وہ کیسا ہی حقیقی اور عظیم کیوں نہ ہو، خدا کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ قدر و منزلت کی چیز دراصل اتباع حق اور پروردگار کی رضا ہوئی ہے اور علم کی قدر بھی اسی لئے ہے کہ وہ عمل صحیح کا ذریعہ ہے۔ اگر علم ہو اور اس کے خلاف عمل کیا جائے تو یہ انسان کو اور زیادہ غضب کا مستحق بنا دیتا ہے۔

ضمناً ایک نکتہ اور بھی اس انداز بیان سے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا اپنے علم کے ذریعے سے بلند ہونا پرہیزگار حقیقت میں اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے توفیق نہ ملے تو کوئی شخص اپنے علم کے بل بوتے پر اس نعمت کو حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ تجربہ علم کوئی وزن نہیں رکھتا۔ خود علم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ کسی نیچے کو اُچھا کر دے۔ بلندی پر پہنچنے کے لئے علم کے ساتھ دوسرے بہت سے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے جو اگر مساعد نہ ہوں تو علم کے باوجود آدمی پست حال رہتا ہے۔ اور اسباب کا مساعد ہونا اللہ ہی کی توفیق پر منحصر ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ "لَسَوْفَ نَحْشَاكَ" میں جو ضمیر ہے اس کا مرجع کفر ہے نہ کہ وہ شخص جس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے آیت کی تفسیر یہ ہوگی اگر ہم چاہتے تو اپنی دی ہوئی آیات کے ذریعے سے اس شخص کے اندر سے کفر نکال دیتے، امام مجاہدؒ اور عطاءؒ اسی طرف گئے ہیں۔ اگرچہ یہ خیال بھی اپنی جگہ صحیح ہے لیکن پہلے جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے وہی اس آیت کا اصلی مفہوم ہے اور یہ دوسرا مفہوم اس کے لوازم میں سے ہے۔ دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں۔ مباد کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں سلف کی تفسیر کا یہ بھی ایک اصول اور طریقہ تھا کہ وہ بسا اوقات آیتوں کی حقیقی مراد بیان کرنے کے بجائے اس کے لوازم اور مقتضیات بیان کر دیا کرتے تھے، جو لوگ ان کے اس طریقہ سے ناواقف ہیں وہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان کے نزدیک آیت کا مفہوم ہی یہی ہے۔

کتاب الہی پر عمل چھوڑ دینے والے علماء کی مثال :-

جن لوگوں کو توراة دی گئی پھر انہوں نے اسے اٹھانے سے (اس کے احکام پر عمل کرنے سے) عملاً انکار کر دیا ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں، جو لوگ آیات الہی کو جھٹلاتے ہیں ان کی مثال بہت بڑی ہے اور اللہ راہ راست سے تجاوز کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

مَثَلُ الَّذِينَ حَمَلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ شَوُّوا
يَحْمِلُونَهَا كَمَثَلِ الْجَمَلِ زَاحِمًا
بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ
(جمعہ)

یہاں ان بد سجت علماء کی مثال بیان کی گئی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب دی تاکہ وہ اس پر ایمان لائیں، اس میں غور و تدبر کریں اس کے فرمان کے مطابق عمل کریں، لیکن انہوں نے اس عطیہ الہی کے ساتھ اعتناء نہ کیا، اس کی تعلیمات کی عملاً مخالفت کی، اور اس کی آیات کو طوطے کی طرح پڑھ لینے کے ہوا ان سے کوئی تعلق نہ رکھا، وہ جب کتاب الہی کے الفاظ زبان سے دہراتے تو ان کی تلاوت بس طلق سے اوپر ہی اُپر رہتی، دل برا لیا فضل چڑھا رہتا کہ کتاب کا کوئی اثر اندر نہ آتا، اس طرح فہم و تدبر اور عمل و اتباع کے بغیر محض کتاب کے الفاظ دہراتے